# گوشۂ منور

## (پروفیسر میرزا محمد منوّر مرحوم کے لیے ارمغان عقیدت)

پروفیسر مرزا محمد منور - ۷ فروری ۲۰۰۰ء کو اس دارفانی سے رخصت ہو گئے - وہ اقبال اکادمی پاکستان کے طویل عرصہ تک ڈائریکٹر رہے - انہوں نے اقبال اکادمی پاکستان کی تنظیم نو کی ، اکادمی میں علمی اور فکری منصوبوں کا آغاز کیا - اندرون ملک اور بیرون ملک علامہ اقبال کی فکر کو متعارف کرانے کے لیے دورے کئے ، خطبات دیئے ،متعدد کانفرنسوں میں شرکت کی ، کلیات اقبال اردو اور فارسی کا مستند نسخہ شائع کیا ، اکادمی نے ان کی رہنمائی میں فکر اقبال پر کتب شائع کیں اور ان کتب کی متعدد جگہوں پر اندرون اور بیرون ملک نمائشیں منعقد ہوئیں -

پروفیسر محمد منور نے اقبال ریویو (انگریزی) اقبالیات (اردو) کے ساتھ ساتھ اقبالیات (عربی) اقبالیات (فارسی) اور اقبالیات (ترکی) شائع کیے تاکہ عالم اسلام میں علامہ کی تعلیمات کا فروغ ہو-

پروفیسر محمد منور ایک اعلیٰ پایے کے ادیب ، مقرر ، شاعر ، مترجم ، مزاح نگار اور ماہر اقبالیات تھے- علامہ اقبال ، قائداعظم ،تحریک پاکستان اور ہندو ذہن کے مطالعے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا - آپ نے اردو ، انگریزی ،عربی ، فارسی میں متعدد مقالات اور کتابیں لکھیں جنھوں نے جریدہ عالم پر ان کے لیے دوام ثبت کر دیا - گوشہ منور ان کی یاد میں اقبال اکادمی پاکستان کا ارمغان محبت ہے- اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے- آمین

ڈاکٹر وحید عشرت
(مدیر)

# مرزا منوّر کی باتیں

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

اپنے مرشد معنوی حضرت علامہ اقبال کی طرح ، پروفیسر محمد منور بھی گونا گوں اوصاف اور خوبیوں کے مالک تھے - ان کی شخصیت کی بہت سی جہتیں ہیں - وہ شاعر تھے ، مقرر تھے ، ادیب تھے ،علم و ادب کے ساتھ ، سیاست سے بھی نظری اور فکری سطح پر ہی سہی ، ایک تعلق اور لگاؤ رکھتے تھے --- اور سب سے بڑھ کر ، علامہ اقبال ہی کی طرح ان کی حیثیت بھی ، ایک معلم اور ملت اسلامیہ کے لیے ایک محبت بھرا اور دردمند دل رکھنے والے مسلمان کی سی تھی --- ایک ایسا پرخلوص انسان جو اپنے وطن ، اپنی ملت اور اہل اسلام کے لیے ہمہ وقت فکر مند و مضطرب رہتا تھا - صحیح معنوں میں : متاع بے بہا ہے ، درد و سوز آرزو مندی ---'' چنانچہ ایسے شخص کی جملہ خوبیوں کا احاطہ کرنا نہ تو کسی ایک شخص کے لیے ، اور نہ کسی ایک مضمون میں ممکن ہے - یہ تو بس ، انہیں یاد کرنے اور ان کی یاد تازہ رکھنے کا ایک موقع ہے -

ایک ادبی نیاز مند اور مداح کی حیثیت میں راقم کو تقریباً ۳۰ ، ۳۲ برس تک مرزا صاحب سے تعلق خاطر رہا --- اس عرصے میں یہ تعلق کبھی کبھار خط وکتابت ، گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضری اور ان کی مجالس میں ان کی گفتگوؤں سے مستفید ہونے سے عبارت ہے --- مرحوم نے اس نیاز مند کو علامہ اقبال پر اپنی آخری کتاب '' قرطاس اقبال'' کا دیباچہ لکھنے کی سعادت سے بھی مفتخر کیا -

۱۹۹۱ء میں راقم کو تقریباً ایک ماہ تک بیرون ملک ، سفر وحضر میں ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا یہ سفر قرطبہ میں منعقدہ ایک اقبال کانفرنس میں شرکت کے سلسلے میں پیش آیا جس میں ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب اور ڈاکٹر محمد سہیل عمر صاحب کے ساتھ یہ نیاز مند بھی مرزا صاحب کے ہم رکاب تھا - قرطبہ ، غرناطہ ، اشبیلیہ ، پیرس اور حجاز مقدس کے اس سفر میں مرزا صاحب مرحوم کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا --- یہ باتیں راقم کے سفرنامہ اندلس (پوشیدہ تری خاک میں ----) میں شامل ہیں ، جو عنقریب کتابی صورت میں شائع ہونے والا ہے -

ذیل میں مذکورہ سفرنامے کے بعض ایسے اوراق پیش کر رہا ہوں جن میں قارئین کو مرزا صاحب کی شخصیت اور ان کے خیالات کی چند جھلکیاں نظر آئیں گی -

(۱)

مدینۃ الزہرا سے واپس آتے ہوئے ، ہم ایک لمحے کے لیے رکے اور مڑ کر ایک بار پھر سیر امور نیا کے اس ڈھلوان قطعے پر نظر ڈالی جہاں اوپر سے نیچے تک مدینۃ الزہرا کے کھنڈر بکھرے ہوئے تھے - ہزار سال پہلے اس کے شان وشکوہ کا کیا عالم ہوگا - چالیس برس تک ایک خوش حال سلطنت کے بے حد وحساب وسائل اس کی تزئین و آرایش پر صرف ہوتے رہے ،مگر اس کا حاصل کیا ہے؟

ایک یورپی مصنف لکھتا ہے :

It was a city that died young as do those loved by God.

مدینۃ الزہرا کے حوالے سے شیخ محی الدین ابن عربی نے ایک جگہ چند ابیات نقل کیے ہیں ،جن کا مفہوم یہ ہے :

تفریح گاہوں کے آس پاس کچھ گھر ہیں جو صاف نظر آتے ہیں -

اس حال میں کہ ان میں رہنے والا کوئی نہیں ہے اور وہ ویران ہیں -

ہر طرف سے پرندے ان پر نوحہ کرتے ہیں - کبھی خاموش ہو جاتے ہیں اور کبھی اپنی آوازوں کی گونج بلند کرتے ہیں -

میں انھی میں سے ایک نغمہ زن پرندے سے مخاطب ہوا -

اس کا دل غم ناک تھا اور وہ سہا ہوا تھا -

میں نے اس سے پوچھا : کس چیز پر نوحہ اور شکوہ کر رہا ہے؟

اس نے کہا : اس زمانے پر، جو گزر گیا اور اب واپس نہیں آئے گا -

اندلس کا نامور شاعر حزم بن جھور ایک بار اس طرف سے گزرا تو مدینۃ الزہرا کے کھنڈر وحشی جانوروں کا مسکن بن چکے تھے - اس کے دو شعر ہیں :

قلت یوماً لدار قوم تفانوا
ابن سکانك العزاز علینا
فاجابت هنا اقاموا قلیلاً
ثم ساروا و لست اعلم اینا

(ایک دن میں نے ان لوگوں کے گھروں سے ، جو فنا ہو گئے ہیں ،کہا :

تمہارے وہ رہنے والے کہاں ہیں جو ہم کو عزیز تھے؟ انہوں نے جواب دیا: کچھ عرصہ وہ یہاں مقیم رہے پھر چلے گئے، معلوم نہیں کہاں؟)

واپسی کے لیے ہم بس میں سوار ہوئے تو مجھے محسوس ہوا کہ مرزا صاحب کچھ کھوئے ہوئے سے ہیں - شاید انہوں نے مدینۃ الزہرا کی باقیات سے گہرا تاثر قبول کیا تھا - مندوبین میں سے بہت سے لوگ نہیں آ سکے تھے - جب ہم چلے تو سہیل بھی نظر نہیں آئے ممکن ہے وہ کسی دوسرے قافلے کے ساتھ یہاں چکر لگا گئے ہوں -

بس کھیتوں کے بیچوں بیچ واقع سڑک سے گزر رہی تھی، میں نے مرزا صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''اچھا ہی ہوا مدینۃ الزہرا بھی دیکھ لیا، ورنہ شاید پھر موقع نہ ملتا-''

''بالکل'' - مرزا صاحب بولے ''بہت اچھا ہوا، مگر سہیل پتا نہیں کہاں رہ گیا؟'' -

''چائے کے وقفے میں تو نظر آئے تھے - فرانسیسی فوٹو گرافر دوست کے ساتھ'' -

''اللہ کا بڑا کرم ہے--- بڑا کرم ہے'' مرزا صاحب کی آنکھوں میں مجھے ایک چمک نظر آئی - یہ مسرت و امتنان کی علامت تھی --- کہنے لگے: ''تمنا تھی' بڑے عرصے سے تمنا تھی - ان مقامات کو' ان یادگاروں اور نشانیوں کو دیکھنے کی' مگر کوئی راستہ نہ تھا --- کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا' جی چاہتا تھا یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھیں - اللہ نے موقع پیدا کر دیا' بڑا کرم ہے اس کا ---''

''واقعی' یہ اس کی خاص عنایت ہے' ورنہ یہ خواب تو کتنے ہی لوگ دیکھتے ہیں'' -

''دیکھو جی'' - مرزا صاحب اپنے مخصوص لہجے میں کہنے لگے: ''جب ہم حضرت علامہ کی نظمیں پڑھتے تھے تو قدرتی بات ہے کہ ہم بھی اندلس کے خواب دیکھتے تھے - کیسی ہو گی مسجد قرطبہ' جس پر حضرت علامہ نے ایسی عدیم المثال نظم لکھ ڈالی --- اسی طرح تاریخوں میں غرناطہ کا ذکر پڑھتے تھے' الحمرا کے عظیم قلعے اور محلات کا --- مسلمانوں کی بنائی ہوئی شاندار عمارتوں کا مدینۃ الزہرا کا --- آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں یہ سب کچھ --- یہ اس کی مہربانی ہے'' -

بس' کھیتوں کے درمیان سے نکل کر شاہراہ پر آ گئی تھی - اس کی رفتار بھی تیز ہو گئی تھی -

''مرزا صاحب'' --- میں نے عرض کیا: ''آپ نے حضرت علامہ کا ذکر کیا اور ان کی شاعری کا --- یہ اعزاز تو انہی کو جاتا ہے کہ انہوں نے اردو کے عام قارئین کو مسجد قرطبہ سے متعارف کرایا' ورنہ اس کا ذکر تاریخ اندلس کی چند کتابوں میں دفن تھا'' -

''ہاں' ہاں' اور یہ ساری کانفرنس بھی تو انھی کے نام پر ہو رہی ہے - اس میں ۲۴ ملکوں

کے مندوبین جمع ہیں''۔

بس رواں دواں تھی اور ساتھ ہی گفتگو بھی ۔ ہم شہر کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ کھیتوں ، راستوں اور مکانوں پر پھیلی ہوئی دھوپ خوش گوار معلوم ہو رہی تھی ۔ اس مختصر مگر حد درجہ معلومات افزا سیاحت سے لوٹتے ہوئے ایک آسودگی اور طمانیت کا احساس ہو رہا تھا جیسے کچھ لے کر آ رہے ہوں ۔

۲۸ نومبر کو ہم غرناطہ میں تھے ۔ کل الحمرا دیکھ آئے تھے اور ایک اعتبار سے آج ہم بالکل فارغ تھے ۔ عزیز الدین احمد علی الصبح تیار ہو کر ہمارے کمرے میں آ گئے ۔ سہیل تو سوتے رہے اور ہم تینوں ناشتے کے لیے قریبی گلی میں واقع ایک کیفے میں چلے گئے--- یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا ۔ میز کرسی کی گنجایش نہ تھی ، اس لیے ناشتا بھی کاونٹر کے سامنے کھڑے کھڑے کرنا پڑتا تھا ، پھر بھی ہمیں یہ کیفے پسند تھا ۔ ایک تو یہ ہمارے ہوٹل سے بہت قریب تھا ، دوسرے : اس کا مالک بابا ہم سے بہت اچھی طرح پیش آتا ۔ وہ ایک ادھیڑ عمر خوش طبع ہسپانوی تھا ۔'' ہر گاہک کے لیے انفرادی توجہ'' کا خیال رکھتا ۔ کیفے کا نام Cafe Helados تھا ، مگر ہم نے اس کا نام '' کیفے ڈی بابا'' رکھ چھوڑا تھا ۔ کل صبح ناشتا یہیں کیا تھا اور شام کی چائے بھی یہیں سے پی۔

ناشتے کے ساتھ ساتھ تبادلہ خیال بھی شروع ہوا ، جو واپس کمرے میں پہنچ کر بھی جاری رہا۔

الحمرا پر گفتگو ہونے لگی اور اس حوالے سے اندلسی مسلمانوں کی تاریخ ، سلاطین غرناطہ ، بادشاہت اور مطلق العنان حکومتوں کی خرابیاں اور ملّی زوال و انحطاط میں ان کی پالیسیوں کے اثرات وغیرہ --- بات سے بات نکلتی گئی ۔

جو لوگ پروفیسر مرزا محمد منور کو جانتے ہیں وہ تو ان کے وسیع مطالعے ، ان کی اسلام دوستی ، ملت اسلامیہ اور پاکستان سے ان کی محبت اور دردمندی ، پھر ان کے توازن فکر و نظر اور ان کی تحریر و تقریر کی صلاحیتوں سے بہ خوبی واقف ہیں ، مگر جو اصحاب ان سے کبھی نہ ملے ہوں ، ان کے لیے بھی پہلی ملاقات ایک خوش گوار تجربہ ثابت ہوتی ہے ، اور ملاقاتی ان کے وسعت معلومات ، ان کے تعمیری جذبات اور ان کے خلوص کا اسیر ہو جاتا ہے ۔ عزیز الدین احمد صاحب اس وقت کچھ ایسی ہی کیفیت سے دو چار تھے ۔

ہوٹل لزبوا کے اس کمرے میں مناسب گرمایش تھی ۔ مرزا صاحب اپنے بستر میں نیم دراز ، محو کلام اور عزیز الدین احمد قریب ہی کرسی پر بیٹھے ، ان کی باتیں توجہ اور انہاک سے سن رہے

تھے - مرزا صاحب تاریخ اسلام اور قرآن پاک کے حوالوں کے ساتھ بڑی موثر گفتگو کر رہے تھے - میں ان کی باتیں بھی سن رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی سامان ، کاغذات اور سفری بیگ بھی مرتب کرتا جا رہا تھا -

سپین میں مسلمانوں کے زوال کا کیا سبب تھا ؟ اس وقت یہ نکتہ زیر بحث تھا -

'' بات بڑی واضح ہے -'' مرزا صاحب کہنے لگے : '' دوقومی نظریے سے انحراف ، زوال مسلم کی بنیادی وجہ ہے - اندلس کا سب سے بڑا فلسفی ابن رشد تھا ، وہ ان یونانی فلسفیوں کا مقلد تھا جن کے ہاں ملک و ملت کا کوئی وسیع تصور موجود نہیں - ہاں ، وہ فقط ایک شہری ریاست (city state) کے قائل تھے -

'' مگر وہ تو ایک بڑا فلسفی اور علم دوست شخص تھا ''- میں نے مرزا صاحب کی گفتگو میں ایک طرح کی مداخلت کرتے ہوئے کہا : '' مطالعے کا ایسا رسیا تھا کہ کہا کرتا : میری زندگی میں صرف دو راتیں ایسی آئیں ، جب میں نے مطالعہ نہیں کیا - ایک میری شادی کی رات اور دوسری جب میرے والد فوت ہوئے ''-

'' عزیزم ، وہ تو ٹھیک ہے '' مرزا صاحب بولے : '' اس کے عظیم ہونے میں کسے شک ہے - اس کا ذوق مطالعہ بھی بجا ، وہ ایک بڑا فلسفی تھا اور اس کا بڑا نام ہے ، مگر ملت کے حوالے سے آپ ذرا سوچیے غور کیجیے --- اچھا ، اور یہاں اہل سپین نے ابن رشد جیسے لوگوں کے مجسمے لگا رکھے ہیں '' -

'' سپین والے تو اسے اپنا زعیم شمار کرتے ہیں ''- عزیز الدین احمد صاحب نے لقمہ دیا-

ابن رشد کا مجسمہ ہم نے قرطبہ کے ایک چوک میں دیکھا تھا - اسی طرح قلہورا عجائب گھر میں بھی اس کا مجسمہ ایستادہ تھا - راقم کو خیال آیا : ابن رشد کے متعلق کہیں پڑھا تھا کہ آخرت اور حشر ونشر کی بابت اس کے عقائد جمہور مسلمانوں سے مختلف تھے - اس کا خیال تھا کہ انسان کو اپنے اچھے یا برے اعمال کی جزا یا سزا دنیا میں مل جاتی ہے - مرزا صاحب نے سوال اٹھایا کہ ایسے اندلسی مسلمان ، مسیحی ہسپانویوں کے نزدیک اتنے اہم کیوں ہو گئے کہ وہ سپین کے اعاظم اور ہیروز کی فہرست میں داخل ہو گئے ؟ ان کی یادگاریں بھی قائم ہو گئیں اور مجسمے بھی نصب ہو گئے؟ --- بلاشبہ یہ ایک اہم سوال ہے جو اہل سپین ، بلکہ پورے اہل مغرب کی '' روشن خیالی '' کے ضمن میں پیش نظر رہنا چاہیے -

میں نے عرض کیا : اس طرح تو حافظ ابن حزم بھی اہل سپین کے ہیروز میں شامل ہیں - ان کا مجسمہ بھی قرطبہ میں نصب ہے -۱۹۶۳ء میں سپین میں سرکاری طور پر '' ہفتہ ابن حزم '' منایا

گیا ، جس میں اس وقت کے صدر مملکت جنرل فرانکو بھی شریک ہوئے - قرطبہ میں ان کا مجسمہ بھی اسی زمانے میں نصب ہوا - اس کے علاوہ سان لور ترو کلیسا کے سامنے واقع ، ان کے گھر کے باہر'' یادگاری تختی'' بھی لگائی گئی -

'' ابن حزم بڑے عالم تھے ، فلسفی تھے ، شاعر تھے'' - مرزا صاحب کہنے لگے : '' مگر آپ کو معلوم ہے ، ان کے ہاں اندلیست کا ایک تعصب یا عصبیت موجود تھی - انہوں نے فضائل اندلس پر باقاعدہ ایک کتاب لکھی ہے جس میں اندلسی شعرا ، فقہا ، محدثین اور مفسرین کو مشرقی اور عربی اہل علم پر اس انداز میں ترجیح دی ہے کہ اس میں واضح طور پر ان کی جانب داری اور طرف داری نظر آتی ہے - مجموعاً بھی وہ مشرق کے مقابلے میں اندلس کی برتری کے قائل تھے اور اسی لیے ہسپانوی مستشرقین نے ان کی اندلیست یا ہسپانویت پر مسرت کا اظہار کیا ہے'' -

'' اچھا'' --- عزیز الدین احمد کچھ حیرت سے بولے - ہمارے لیے یہ انکشاف تھا -

'' اور سنئے'' مرزا صاحب نے اپنی بات جاری رکھی : '' ابن حزم فارسی الاصل تھے - ان کے دادا ، موسیٰ بن نصیر کے ساتھ اندلس پہنچے تھے - ایک کمزور روایت ان کے اندلسی الاصل ہونے کی بھی ہے - ابن حزم خود اس سے متفق نہ تھے مگر بعض ہسپانوی مستشرقین نے انہیں اندلسی الاصل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے - کیوں ؟ --- تاکہ یہ کہا جا سکے کہ ایسا بڑا عالم اصل میں تو ہسپانوی نسل سے تھا - امت مسلمہ سے اس کی نسبت تو ان کے لیے ثانوی ہے'' -

مجھے اچانک ، جیسے کچھ یاد آ گیا --- عرض کیا : '' مگر اقبال نے ابن حزم کے فقہی نقطہ نظر کو تو حق بجانب قرار دیا ہے؟''

'' ہاں'' مرزا صاحب بولے : '' حضرت علامہ اس زمانے کے مخصوص حالات اور پس منظر میں ابن حزم کے خیالات کو درست سمجھتے تھے - مگر عزیز من ! '' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے : '' آپ کو معلوم ہے ابن حزم نے امام ابوحنیفہؒ پر بہت سخت ، بلکہ تشدد آمیز تنقید کی ہے ، جسے اکثر اہل علم نے قطعی ناروا اور غیر متوازن قرار دیا ہے'' -

یہ باتیں ہمارے لیے نئی تھیں - عزیز الدین احمد بہت توجہ سے مرزا صاحب کو سن رہے تھے - ان کی گفتگو جاری تھی : '' اور دیکھیے ، ابن خلدون کو یہ یورپ والے بڑا ابھارتے ہیں ، سوال یہ ہے کیوں ؟ بلاشبہہ وہ بڑا مورخ تھا ، مگر اس کے ہاں تصور ملت نہیں ہے - اس کی عصبیہ ، عصبیہ اسلامیہ نہیں ہے ، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ابن حزم سے متاثر تھا - خود اعتراف کیا ہے'' ---- اس کے بعد مرزا صاحب نے علامہ اقبال کی ایک رباعی پڑھی :

نگہ دارد برہمن کار خود را
نہ می گوید بہ کس اسرار خود را
بہ من گوید کہ از تسبیح بگذر
بہ دوش خود برد زنار خود را

(برہمن اپنے کام اور مشاغل کی نوعیت اور نشیب و فراز اور نفع نقصان سے بہ خوبی واقف ہے اور اپنے راز کسی پر فاش نہیں کرتا - مجھے تسبیح چھوڑ دینے کی تلقین کرتا ہے، مگر اپنے کندھے سے زنار اتارنے کی لیے تیار نہیں -)

"یہاں اندلس میں عیسائی نے بھی یہی کچھ کیا - وہ اندر سے مسیحیت کے معاملے میں پکا تھا، مگر یہ نہیں چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے اندر اسلامی اخوت کا احساس مضبوط ہو - وہ یہاں کے نومسلموں سے کہتا تھا کہ تم تو اندلسی ہو، اور ہم میں سے ہو اور یہ باہر سے آنے والے عرب ہیں، بربر ہیں، افریقی ہیں، شامی ہیں اور یمنی ہیں مگر ہم تم اندلسی ہیں - لیکن مسیحی اور مسلمان، خواہ اندلسی ہی کیوں نہ ہوں، آپس میں بھائی کیوں کر ہو سکتے تھے، چنانچہ مسیحیوں کو جوں ہی بالادستی حاصل ہوئی، انہوں نے اپنے اندلسی (مسلمان) بھائیوں سے وہ کچھ کیا جو کہیں کسی نے مسلمانوں سے نہیں کیا ----"

مرزا صاحب ذرا رکے تو تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی - "یہ تو بہت بنیادی بات ہے، جس کی نشان دہی آپ نے کی -" میں نے گفتگو میں دخل دیتے ہوئے کہا: "زوال امت کے تو اور بھی بہت سے عوامل ہیں ---"

"ہاں ہاں!" مرزا صاحب نے کہا: "میں نے تو ایک بنیادی وجہ بتائی ہے اور یہ بنیادی وجہ آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی - بھارت، پاکستان، بنگال، خلافت عثمانیہ، فلسطین و اسرائیل --- آپ جہاں بھی دیکھیں گے، دو قومی نظریے سے غفلت اور انحراف نے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے -" پھر مرزا صاحب نے تاریخی مثالوں سے اس کی کچھ اور وضاحت کی -

## (۳)

الحمرا کے مختلف حصوں کو دیکھنے کے بعد ہم محلات میں داخل ہوئے اور بعض حصوں کو دوبارہ دیکھا - کل وقت کم تھا، اس لیے یہاں سے سرسری گزر گئے تھے - آج قدرے اطمینان سے دیکھا تو ہر جا جہان دیگر نظر آیا - نقش و نگار کا حسن و جمال قابل داد ہے اور عبارات و اقوال عبرت کا باعث - ایک جگہ لکھا تھا: اقبل علی الصلوۃ ولا تکن من الغافلین -- مگر

افسوس ہے غفلت سے بچنے کی یہ تلقین الحمرا کی دیواروں تک ہی محدود رہی اور سلاطین غرناطہ نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا - بلاشبہ در و دیوار پر تو ہر جگہ لا غالب الا اللہ نظر آتا ہے، مگر شاہان غرناطہ کے دلوں کی تختی کوری کی کوری رہی :

مومن و از رمز مرگ آگاہ نیست
در دلش لا غالب الا اللہ نیست

غرناطہ، اندلس میں مسلمانوں کا آخری حصار تھا لیکن حکمرانوں نے جملہ مال و دولت اور میسر وقت اپنے فانی اقتدار کے استحکام، محلات کی تعمیر اور فنون لطیفہ کے نقوش مرتسم کرنے ہی میں صرف کر دیا - مرزا صاحب کہنے لگے : اگر شبستانوں اور گلستانوں پر صرف ہونے والا بے حساب خزانہ طاقت ور فوج تیار کرنے پر صرف ہوتا تو شاید آج صورت حال مختلف ہوتی -

(۴)

۲۹ نومبر (جمعہ) کو ناشتے کے بعد، مرزا صاحب اور راقم سیر کے لیے نکلے - اثنائے گفتگو میں اے کے بروہی صاحب کا ذکر آ گیا، کہنے لگے :

مرحوم بروہی بڑے پرگداز آدمی تھے - ان کے مزاج میں انکسار بہت تھا - انہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں وزیر رہا ہوں یا دنیا کا ایک شہرت یافتہ قانون دان ہوں اور یہ شخص جو میرے پاس آتا ہے، محض ایک اسسٹنٹ پروفیسر ہے، اور یہی حال راجا حسن اختر کا تھا- وہ بھی دل گرم کے مالک تھے، ان کا مسلک تھا :

خوش تر ز ہزار پارسائی
گامے بطریق آشنائی''

میں نے سوال کیا: ''ان سے آپ کی پہلی ملاقات کب ہوئی ؟''

کہنے لگے : ''ہاں ! ان سے پہلی ملاقات بھی دلچسپ ہے- میں نے لائل پور (حال فیصل آباد) میں یوم اقبال کے جلسے میں مقالہ پڑھا - کچھ اور حضرات نے تقریریں کیں جن میں راجا صاحب بھی شامل تھے- میں ان کی تقریر سننے کے بعد جلسے سے کھسک گیا - گرمی کا موسم تھا اور رمضان کا مہینا، مجھے یاد ہے کہ میں دھوپ سے بچاو کے لیے، گھر جاتے ہوئے چھتری تانے ہوئے تھا - خیر، تو دراصل میرے اندر بچپن سے ایک حجاب تھا، اس لیے میں ملنے ملانے میں پہل نہیں کرتا تھا - اب بھی یہی حال ہے، اسی لیے جلسہ ختم ہونے کو تھا تو خاموشی سے اٹھ کر گھر چلا آیا -- اب جلسے کے بعد راجا صاحب نے پوچھا : ''جن پروفیسر صاحب نے '' کلام اقبال پر عربی ادب کے اثرات'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا تھا، وہ کہاں ہیں؟''

احباب نے بتایا کہ گھر چلا گیا ہے ، اگر آپ کہیں تو گاڑی بھیج کر اسے بلا بھیجیں ؟ راجا صاحب نے فرمایا: ''نہیں ، عالم آدمی کے پاس میں خود جایا کرتا ہوں'' -

''میری عمر ۳۲ ،۳۳ سال تھی -'' مرزا صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا : اور وہ میرے بزرگ تھے ، جو علامہ اقبال کی محفل میں ۱۴ سال بیٹھے تھے ، مگر یہ ان کی عظمت تھی کہ محض ایک مقالہ سن کر ملاقات کے لیے گھر پہنچے - بہرحال مصافحہ اور معانقہ ہوا اور پھر مفصل تعارف - اس کے بعد تو ایسے تعلقات قائم ہوئے کہ ان کی وفات پر ہی یہ سلسلہ منقطع ہوا ، بلکہ وفات پر بھی کہاں منقطع ہوا ، میں تو اب بھی ان کو بلاناغہ یاد کرتا ہوں ، ان کی روح کو روزانہ ایصال ثواب کرتا ہوں - قرآن کا کچھ حصہ ان کی خاطر ضرور تلاوت کرتا ہوں ، ان کی دعائیں بھی مجھے پہنچتی ہیں -''

ہم کامپلو چوک سے گزرتے ہوئے بڑی سڑک پر پہنچ چکے تھے - پھر اسی سڑک کے اوپر سے گھومتے ہوئے واپس ہوٹل پہنچے -

آج سپین میں ہمیں ایک ہفتہ ہو گیا تھا - دوپہر کو توسیع شدہ ویزا ملنے کی امید تھی - سوچا : آج نہیں تو کل ہمیں یہاں سے اشبیلیہ روانہ ہونا چاہیے - سو ، میں بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگا - سہیل صاحب جاگ اٹھے - وہ ناشتے (دوپہر کے کھانے ) سے عہدہ برآ ہونے کی کاوش کرنے لگے - میں نے دو تین خطوط لکھے - تاریخ ہسپانیہ کی ورق گردانی کی - مرزا صاحب سے کچھ گفتگو بھی رہی - ان کی طبیعت پر اس احساس کے باعث مسلسل آزردگی اور افسردگی طاری رہی کہ امت مسلمہ نے ایسا خوب صورت وطن کھو دیا -

# پروفیسر محمد منوّر

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی

میں اپنی معروضات اردو کے ایک شاعر غلام مصطفیٰ خان یک رنگ کے ایک شعر سے شروع کر رہا ہوں - یک رنگ نے اپنے بزرگ معاصر مرزا مظہر جان جاناں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا -

یک رنگ نے تلاش کیا ہے بہت سنو
مظہر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں

میں مرزا محمد منور کو بھی اس شعر کا مصداق سمجھتا ہوں - میرے خیال میں اس جہاں میں منور سا بھی کوئی میرزا نہیں تھا -

**خواتین و حضرات !**

میں نے یہ شعر مرزا صاحب کے نام کی رعایت ہی سے نہیں پڑھا - میرے پیش نظر مغلوں کے دور آخر میں رائج ایک اصطلاح مرزا منشی بھی رہی ہے جس کا اطلاق شخصیت کے توازن وضعداری اصابت فکر اور سلامت روی پر ہوتا تھا - خداوند کریم نے مرزا محمد منور کو ان تمام اوصاف سے نواز رکھا تھا - ایمان کے نور سے ان کا باطن منور اور ظاہر روشن تھا، قدرت نے اس خوش خصال کو مروت اور آدم داری کی ایسی فطرت عطا کی تھیں کہ ہزاروں لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے تھے -

ان کا علم و فضل ، ان کی مرزا منشی پر مستزاد تھا - وہ صرف عالم ہی نہ تھے بلکہ ایسے جامع العلوم تھے کہ ماضی قریب یا ان کے معاصرین میں اس کی مثال شاذ ہی ملتی ہے - وہ اسلامی تاریخ تہذیب ، فکر ، فلسفہ ، تصوف ، تفسیر ، ثقافت و سیاست اور شعر و ادب پر گہری نظر رکھتے تھے - عربی ، فارسی ، اردو ، انگریزی چاروں زبانوں پر عبور رکھتے تھے - حافظہ ایسا پایا تھا کہ ان کو دیکھ کر حماد الراویہ کے تاریخی شخصیت ہونے کا یقین آ جاتا ہے حماد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کو دور جاہلیت کی کم و بیش ساری شاعری یاد تھی - مرزا صاحب

کو معلقات، متنبّی، معریٰ کے عربی، حافظ، نظیری، صائب، بیدل اور دیگر شعرا کے ہزاروں فارسی اشعار یاد تھے اور علامہ اقبال کا بیشتر اردو فارسی کلام ان کے حافظے میں محفوظ تھا-

مرزا صاحب کے علمی کارناموں کی فہرست طویل ہے اگر ان کارناموں میں ان کے شاگردوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو فہرست اور بھی طویل ہو جائے گی - مرزا صاحب بنیادی طور پر استاد تھے وہ بڑے ہی ممتاز اور منفرد قسم کے استاد تھے - بطور استاد ایک تو ان کا وسیع علم وجہ امتیاز تھا دوسرے وہ عام استادوں سے بہت مختلف تھے وہ صرف کورس پڑھانے اور کلاس لینے والے استاد نہیں تھے وہ آدم گر اور شخصیت ساز استاد تھے - تدریس ان کا پیشہ یا مشغلہ نہیں تھا بلکہ یہ ان کا مسلک اور مشن تھا - ان کے اخلاص نے ان کی بات میں ایسی تاثیر پیدا کی تھی کہ ایک بار جو کوئی ان کے حلقہ درس میں آیا عمر بھر کے لیے حلقہ ارادت میں آ گیا اگر کوئی ان ارادت مندوں کو جمع کرے تو ایک وسیع ''حلقہ منوّریہ'' وجود میں آ جائے - اللہ نے مرزا صاحب کے علم میں برکت بھی دی اور تاثیر بھی - اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مولانا روم کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے علم کے مادی پہلو کو نظر انداز کر کے اور اس کے روحانی پہلو پر توجہ کی اور اس کو اپنا یار بنا لیا تھا

علم را بر تن زنی ماری بود
علم را بر دل زنی یاری بود

مرزا صاحب فارسی کے کبھی باقاعدہ طالب علم نہیں رہے لیکن انہوں نے فارسی زبان و ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا وہ فارسی شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے - ایک بار گولڑہ شریف کے پیر نصیر الدین اورینٹل کالج تشریف لائے ان کے ساتھ دو گھنٹے کی ایک یادگار شعری نشست رہی جس میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سید اکرم شاہ، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، صوفی افضل مرحوم اور دیگر کئی حضرات شریک ہوئے - اس دن مرزا صاحب نے فارسی کے اتنے عمدہ ۳۷ شعر سنائے کہ سب لوگوں نے انہیں دل کھول کر داد دی - اقبال کی فارسی غزل میں مرزا صاحب نے تقابل کے لیے دوسرے شعرا کی فارسی غزلیات کے جو نمونے درج کیے اس سے ان کی خوش ذوقی اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے - مرزا صاحب کبھی کبھار فارسی میں شعر کہہ لیا کرتے تھے لیکن جہاد افغانستان میں تو ان کی شاعری کے سوتے اُبل پڑے فارسی میں ان کے جنگی ترانوں نے مجاہدین کے حوصلے بڑھائے افغانی نقاد آج بھی ان ترانوں کے رجزیہ اور رجائی لہجے کے معتقد ہیں - اللہ تعالیٰ نے مرزا صاحب کو سیاسی بصیرت عطا کی تھی اور انہوں نے روسی یلغار سے بھی پہلے روس کے زوال کی پیش

گوئی کر دی تھی روس کی شکست کے بارے میں ان کا یہ احساس ان کے ولولہ انگیز فارسی ترانوں میں ڈھل گیا تھا -

مرزا صاحب کا اصل مضمون عربی تھا - ان کے ذاتی ذخیرہ کتب میں عربی کتابوں کا ایک وقیع سرمایہ موجود ہے - مرزا صاحب عربی شاعری سے گہرا شغف رکھتے تھے جدید و قدیم ادب پر نظر رکھتے تھے - دینوی کی اخبار الطّوال اور طہٰ حسین کی الفتنۃ الکبریٰ جیسی بلند پایہ عربی کتب کا مرزا صاحب نے اردو میں ترجمہ کیا اس سے ان کی عربی دانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے - مرزا صاحب عربی میں بھی شعر کہتے تھے - لاہور میں منعقد ہونے والی دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس کے سلسلے میں مرزا صاحب نے بڑی ایمان افروز نظمیں لکھیں -

تاریخ و تحریک پاکستان مرزا صاحب کا خاص موضوع تھا انھوں نے تشکیل پاکستان کا معجزہ رونما ہوتے خود دیکھا - قیام پاکستان کے بعد مخالفین نے تحریک اور نظریہ پاکستان کے بارے میں بڑی غلط فہمیاں پیدا کیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے - ان میں مایوس و نامراد پاکستانی سیاست دان ، مسلم دشمن یورپی اہل قلم اور ہمارے ازلی و ابدی دشمن ہندو شامل ہیں - مرزا صاحب نے ان تینوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا - ان کے دلائل پاکستان پر ان کے غیر متزلزل ایمان کے علاوہ ٹھوس دستاویزی شہادتوں پر مبنی ہیں- تحریک پاکستان کے موضوع پر شاید ہی کوئی قابل ذکر کتاب ہو جو مرزا صاحب کی نظر سے نہ گزری ہو -

مرزا صاحب نے اپنے ایک ٹیلی وژن پروگرام میں علامہ اقبال اور قائد اعظم کے پیغامات کو بڑی خوبصورتی سے سمیٹا ہے - علامہ اقبال کے پیغام کا خلاصہ خود کو پہچانو اور قائد اعظم کا پیغام ہے اپنے دشمن کو پہچانو ---- چنانچہ مرزا صاحب نے پاکستان کے ازلی اور ابدی دشمن ہندو کی تاریخ اور نفسیات کا عمیق مطالعہ کیا ہے اس موضوع پر ان کی کتاب دیوار برہمن ان کی قابل قدر تصنیف ہے -

مرزا صاحب کی تمام علمی حیثیتیں اپنی اپنی جگہ مسلم ہیں لیکن ان کی غالب حیثیت بطور اقبال شناس کی ہی ہے - انھوں نے اپنی بیشتر توانائیاں فکر اقبال کو عام کرنے میں صرف کی ہیں اس موضوع پر اردو ، انگریزی اور تراجم کی شکل میں فارسی میں متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں - انھوں نے اقبال کا مطالعہ فکر اسلام کے وسیع تناظر میں ذہن مستقیم اور قلب سلیم کے ساتھ کیا ہے -

اسلام کو درپیش مسائل کا حل بھی فکر اقبال کی روشنی میں پیش کیا ہے وہ اقبال کو حالات حاضرہ سے مربوط رکھتے ہیں اور اس طرح اس کی تازگی وتعلق کو برقرار رکھتے ہیں مرزا صاحب علامہ اقبال کے ساتھ حد درجہ عقیدت رکھتے ، میں ۴۸ سال ان کی خدمت میں رہا لیکن ایک بار بھی انہیں اقبال کہتے نہیں سنا ، وہ عام طور پر حضرت علامہ اقبال کہتے یا حضرت علامہ - مرزا صاحب کو آغا شورش کاشمیری نے سفیر اقبال کا خطاب دیا تھا یہ مرزا صاحب کی خوش بختی ہے کہ انھوں نے اس سفارت کے فرائض بطریق احسن انجام دیے - انھوں نے اقبال کا پیغام کئی ذریعوں اور کئی زبانوں کے واسطے سے پہنچایا - ملک کے اندر جہاں بھی انہیں بلایا گیا وہ تشریف لے گئے - کئی سال تک وہ مرکزیہ مجلس اقبال کے جلسوں کی جان رہے - انھوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لاتعداد پروگراموں میں شرکت کی - انہیں قاہرہ اور دمشق جانے کا بھی اتفاق ہوا وہاں انھوں نے عربی میں تقریر کی - دمشق میں اقبال پر ان کی تقریر سے وہاں کے مفتی اعظم اتنے متاثر ہوئے کہ مرزا صاحب سے ان کے ہوٹل میں ملنے کے لیے آئے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ کیا پاکستان کے پاس ایٹم بم ہے مرزا صاحب کا اثبات میں جواب سن کر وہ الحمداللہ الحمداللہ کہتے کہتے بے حال ہو گئے - مرزا صاحب تہران میں عالمی اقبال کانفرنس میں بھی شریک ہوئے وہاں انھوں نے فارسی میں تقریر کی - کئی یورپی ممالک کے دارالحکومتوں میں بھی مرزا صاحب نے پیام اقبال انگریزی میں پہنچایا - فکر اقبال کی تبلیغ کے اتنے مواقع شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوئے ہوں یہ بھی مرزا صاحب کا ایک منفرد اعزاز ہے -

ہمارے زمانے میں اقبال شناسی کے ساتھ ساتھ اقبال فروشی کو بھی بہت فروغ حاصل ہوا اور بہت سے لوگوں نے اقبال کے نام پر اپنی دکان چمکائی لیکن مرزا صاحب کے لیے تو اقبال ایمان و اعتقاد کا مسئلہ تھا - اقبال شناسی ان کی کوئی پیشہ وارانہ مجبوری نہیں تھی انھوں نے اقبالیات کا صرف مطالعہ ہی نہیں کیا اس سے اثر بھی قبول کیا - ان اثرات کی جھلک ان کی سیرت و کردار میں دیکھی جا سکتی ہے - فکر اقبال سے متاثرا ان کے کردار کی کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں -

علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات کی کمیٹی کا پہلا اجلاس ذوالفقار علی بھٹو کی صدارت میں گورنر ہاؤس لاہور میں منعقد ہو رہا تھا - بھٹو صاحب کے عروج کا زمانہ تھا اور وہ اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ اجلاس میں بھی شریک تھے ان کے انتہائی مقتدر وزیر ، حفیظ

پیرزادہ صاحب نے ورکنگ پیپر پڑھنا شروع کیا "تیسری دنیا کے عظیم شاعر ---- پہلے جملے ہی پر ایک آواز بلند ہوئی کہ جناب والا اقبال شاعر اسلام پہلے ہیں اور تیسری دنیا بعد میں آتی ہے- وزیر صاحب نے احتجاج کو نظر انداز کر کے آگے پڑھنا چاہا تو انہیں پھر روکا گیا - احتجاج کرنے اور روکنے والے ایک درویش محمد منور ہی تھے جنہیں یہ جرأت فکر اقبال ہی سے ملتی تھی ورنہ اس محفل میں کسے یارائے سخن تھا -

ہائیڈل برگ اور کیمبرج میں اقبال چیئرز کے انتخاب میں مرزا صاحب کو بھی انٹرویو کے لیے بلایا گیا- وہ اس پر راضی نہیں تھے - احباب کے اصرار پر وہ آ گئے راقم الحروف وزارت تعلیم میں ان کے ساتھ گیا - ہماری یہ خواہش تھی کہ مرزا صاحب جیسا جید اقبال شناس اگر کسی چیئر پر چلا جائے تو کیا کہنے- انٹرویو لینے والے وفاقی سکریٹری تعلیم ایک ایسے شخص تھے جن کا خاندان قائد اعظم اور پاکستان مخالفت میں بڑی شہرت رکھتا تھا میں نے مرزا صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ اس سیکرٹری کے سامنے آپ ذرا احتیاط برتیں تو زیادہ مناسب ہوگا میرا یہ مشورہ انھیں ناگوار گذرا انھوں نے فرمایا کہ یہ چیز تو آنی جانی چیز ہے اس کے لیے میں اپنے ایمان واعتقاد سے دستبردار نہیں ہوسکتا - سوا گھنٹے کے انٹرویو میں مرزا صاحب ایک گھنٹہ قائد اعظم کے فضائل بیان کرتے رہے اور سیکرٹری صاحب اپنی کرسی پر پہلو بدلتے رہے -

مرزا صاحب کے عشاق میں بڑے بڑے لوگ شامل تھے ان میں ایک مسٹر اے کے بروہی بھی تھے وہ جب بھی لاہور آتے مرزا صاحب سے ملاقات کی کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتے ایک ملاقات میں انھوں نے مرزا صاحب کو ادارہ تحقیقات اسلامی ، اسلام آباد کی سربراہی کی پیشکش کی اور اصرار کیا کہ وہ اسے فوراً قبول کر لیں - مرزا صاحب نے اپنے احباب سے مشورہ کیا - ایک ارادت مند نے عرض کیا آپ اب جس آزادی کے ساتھ <u>نوائے وقت</u> میں اظہار خیال فرما رہے ہیں اس عہدے کو قبول کرنے کے بعد آپ کو اظہار کی یہ آزادی حاصل نہیں رہے گی - مرزا صاحب نے اس مشورے کو قبول کرتے ہوئے معذرت کر لی حالانکہ اس عہدے کے ساتھ بڑی مراعات وابستہ تھیں لیکن مرزا صاحب اپنے مشن کی قیمت پر مراعات کے طالب نہ ہوئے-

اقبال ایوارڈز میں ایک بار مرزا صاحب کی ایک کتاب بھی شامل ہو گئی - انعام کی رقم خاصی معقول تھی اور ان کی کتاب بھی انعام کی سزاوار تھی لیکن مرزا صاحب نے یہ کہہ کر اپنی کتاب ایوارڈ سے واپس لے لی چونکہ اقبال اکادمی کا سربراہ ہوں اس لیے میری کتاب

اس ایوارڈ میں شامل نہیں ہونی چاہیے-

مرزا صاحب کی زندگی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے- ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علم کے معاملے میں وہ صرف نظری آدمی نہیں تھے یہ ان کے ایمان و اعتقاد کا جزو تھا-

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے اپنے وقار و اعتبار میں اضافہ کرنے کے لیے مرزا صاحب کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن ان کی شدید علالت کی وجہ سے اس فیصلے پر عملدرآمد نہ ہو سکا - مرزا صاحب ایک عظیم شخصیت تھے - وہ اس ملک کا حتمی ورثہ تھے ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے- ان کے نام پر ایک ٹرسٹ قائم کیا جانا چاہیے جو ان کی تصانیف و تقاریر کی حفاظت و اشاعت کا بندوبست کرے-

# مرزا محمد منور ---- اقبال کا شیدائی

ڈاکٹر انور سدید

پروفیسر مرزا محمد منور کی وفات پر ادبی ، دینی اور سیاسی حلقوں نے انہیں یکساں طور پر خراج تحسین ادا کیا - تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ان تمام حلقوں کی غیر متنازعہ شخصیت تھے - ان کا اپنا متنازعہ موضوع انگریز اور ہندو تھا ، جس کے خلاف وہ زندگی بھر سیف بدست رہے - ان کے ترکش میں جو تیر تھے ، مرزا منور نے انہیں اقبال کے تصورات سے صیقل اور قائد اعظم کے عمل پیہم سے تیز تر کیا تھا ، ان تیروں کی مزید چبھن انھوں نے دین مصطفی کی تعلیمات قرآن سے بڑھائی تھی اور انہیں کفر کی طاقتوں کے خلاف استعمال کیا تھا- چنانچہ انہیں سیاست میں اسلام کا داعی اور فکر وعمل میں اقبال اور قائد اعظم کا مقلد قرار دے کر محافظ دین وملت قرار دیا جاتا تھا اور یہ بڑی حد تک درست تھا -

اہم بات یہ تھی کہ پروفیسر محمد منور نے موروثی مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کو اپنے مطالعے سے اخذ کیا اور اسے دین عالم کے طور پر قبول کیا ، اقبال کو وہ تصور پاکستان کا خالق تسلیم کرتے تھے اور فکر اقبال کو ہندو کی ریشہ دوانیوں کا جواب قرار دیتے تھے - قائد اعظم کی عظمت کا باعث ان کے نزدیک یہ تھا کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی شکست خوردہ قوم کو حالت انتشار سے مجتمع کیا اور جمہوریت کی روایات کے مطابق جدوجہد پاکستان استوار کی اور بالآخر انگریز اور ہندو کی سازش کو ناکام بنا کر پاکستان حاصل کر لیا-

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مرزا منور کا تعلق سرگودھا کے ایک متوسط لیکن قناعت پسند گھرانے سے تھا - ان کے والد مرزا ہاشم الدین میونسپل کمیٹی سرگودھا کے ایک پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے - ان کے طالب علموں کا افتخار یہ تھا کہ مرزا ہاشم الدین نصابی تعلیم اور ادبی تربیت کے علاوہ ان کی شخصیت سازی بھی کرتے تھے - مرزا منور بھی اس گہوارے سے ادیب بن کر نکلے تھے - سکول کے زمانے میں ہی انہیں شعر و ادب سے دوستی ہو گئی تھی - ان کی زندگی کے ابتدائی دور میں خلافت کی تحریک اور پھر مجلس

احرار کی کشمیر تحریک کو مسلمانوں میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی - ان کے مزاج پر لڑکپن میں مولانا ظفر علی خان نے اپنے اثرات مرتب کئے - ظفر علی خان کے جلسے میں مرزا منور کو ان کے والد گرامی ہی لے کر گئے تھے - مولانا ظفر علی خان نے اس روز سرگودھا میں بڑی جوشیلی تقریر کی تھی - اس تقریر نے ہی مرزا منور کے دل میں انگریز دشمنی کا پہلا بیج بویا - انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''میرے کان میں پہلی اذان مولان ظفر علی خان نے دی تھی- انہیں یاد تھا کہ سرخ ٹوپی پہن کر اور چھڑی کو فضا میں لہرا کر جو بزرگ تقریر کر رہے تھے، وہ مولانا ظفر علی خان ہی تھے، جو کہہ رہے تھے -

'' یہ گورے اور گوریاں جو ہمارے وطن میں گھس آئی ہیں انہیں یہاں سے نکالا جائے''

سیاست کے اس ارتقاء کا سلسلہ انہیں اقبال اور قائد اعظم تک لے آیا جنہوں نے دو قومی نظریہ پیش کیا تو انگریز حکمرانوں کے علاوہ ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کے داعی ہندوؤں کے سامنے مطالبہ پاکستان پیش کر دیا -

اپنے تعلیمی دور میں مرزا محمد منور کو مرزا غالب سے محبت پیدا ہو گئی تھی، وہ فطرتاً تغزل پسند تھے لیکن غالب کے تغزل میں انہیں ایک عجیب شان کج کلاہی نظر آئی، اور یہ مرزا ہاشم الدین کا فیضان تھا کہ انہیں دیوان غالب نصف سے زیادہ از بر ہو گیا - اس دور میں ہی انہیں اقبال سے بھی محبت پیدا ہوئی لیکن یہ عقیدت کا درجہ اختیار کر گئی اور اقبال آہستہ آہستہ مرزا منور کے مرشد معنوی بن گئے - بعد میں انھوں نے اقبال کو اپنا ایک مستقل موضوع قرار دیا اور ان کے افکار و تصورات پر ایقان اقبال، میزان اقبال، برہان اقبال، قرطاس اقبال اور اقبال کی فارسی غزل گوئی جیسی کتابیں تصنیف کیں -

مرزا منور کی زندگی ایک مستغنی مزاج اور قناعت پسند انسان کی زندگی تھی، وہ غریب گھرانے کے فرد تھے اور میٹرک کے بعد انھوں نے ذوق و شوق سے عربی، اردو اور فلسفہ میں تین ایم اے کئے - میٹرک کے بعد انھوں نے پہلے ریلوے میں اور پھر محکمہ آبپاشی میں معمولی قسم کی ملازمت اختیار کی - ان ملازمتوں نے ان کے دل میں ناآسودگی کا احساس بیدار کیا اور وہ پنجاب اسمبلی کی مجلس ترجمہ میں ملازم ہو گئے- انھوں نے کچھ عرصہ ''مجلس زبان دفتری'' میں اردو اصطلاحات سازی کا کام بھی کیا - لیکن ایم اے کرنے کے بعد درس و تدریس کے شعبے میں آ گئے - پہلے گورنمنٹ کالج لائل پور (حال فیصل آباد) میں اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ اردو میں تدریسی خدمات انجام دیں - ۱۹۸۰ء کی دہائی

میں ریٹائر ہوئے تو اس وقت ان کی اقبال شناسی اور تصنیف و تالیف کی شہرت کا سکہ بیٹھ چکا تھا اور وہ ڈاکٹر طہٰ حسین کی کتاب الفتنہ الکبریٰ حسین نصر کی کتاب تین فیلسوف اور اخبار الطّوال الدینوری کے تراجم کر چکے تھے - چنانچہ انہیں پنجاب یونیورسٹی میں '' اقبال چیئر'' پر فائز کیا گیا اور بعد میں اقبال اکادمی کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا - ان کی زندگی کا آخری دور فروغ وفکر اقبال میں گزرا - اس دور میں ہی انھوں نے دفاع پاکستان کا فریضہ فکری سطح پر انجام دیا - ان کی کتابیں دیوار برہمن --- پاکستان حصار اسلام اور مشاہدہ حق کی گفتگو اسی دور میں شائع ہوئیں - اردو شاعری کا مجموعہ غبار تمنا کے نام سے اور شگفتہ مزاح کی کتاب اولاد آدم کے عنوان سے شائع ہوئی -

مرزا محمد منور مجلسی انسان تھے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے یہ مجلس آرائی تحریک پاکستان کے اکابر سے سیکھی تھی - ان اکابر میں جسٹس رستم کیانی ، راجہ حسن اختر ، ڈاکٹر جاوید اقبال ، حمید نظامی ، مجید نظامی ، ڈاکٹر سید عبداللہ ، قریشی عبداللہ شاہ ، نعیم صدیقی اور زیڈ اے سلہری جیسے لوگ شامل تھے - وہ اپنی مجلس گورنمنٹ کالج لاہور میں جماتے جہاں ان کے معاصرین شیخ عبدالشکور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ، ڈاکٹر تحسین فراقی ، پروفیسر صابر لودھی ، غلام الثقلین نقوی ، ڈاکٹر خورشید رضوی ، ڈاکٹر محمد احسان الحق جیسے لوگ معاملات جہاں پر خیال افروز گفتگو کرتے ان محفلوں میں لطیفہ بازی اور شگفتہ گوئی بھی ہوتی اور بات سے بات نکلتی جاتی -

نوائے وقت لاہور کے مدیر '' سرراہے'' پروفیسر محمد سلیم ان کے دوست تھے - انھوں نے ان کی وفات پر تعزیتی مضمون لکھا تو اس میں مرزا محمد منور کی چند زعفرانی باتیں بھی خوبصورتی سے سجا دیں - اس ضمن میں انھوں نے لکھا کہ مرزا منور کو ایک زمانے میں '' عرق النساء'' کی شکایت ہوگئی تھی - درد تو جا تا رہا لیکن ان کی ایک ٹانگ میں تھوڑا سا خم آ گیا - بعض لوگوں نے انہیں لارڈ بائرن کہا تو مرزا صاحب ناراض ہو گئے اور بولے '' یہ تیموری چال ہے اور عطیہ خداوندی ہے'' -

مدیر '' سرراہے'' نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کا حلقہ احباب محدود تھا - ان کی عادات بڑی نستعلیق تھیں - ان دنوں وہ چائے کے ساتھ ایک مخصوص قسم کے بسکٹ استعمال کرتے تھے جنہیں ان کے احباب نے '' مرزائی بسکٹ'' کا نام دے رکھا تھا - چنانچہ جب بھی مرزا صاحب دوستوں کے ساتھ کالج کی کنٹین میں داخل ہوتے تو ان میں سے ایک دوست کنٹین والے کو آرڈر دیتا -

"چار چائے اور آٹھ مرزائی بسکٹ"

پروفیسر سلیم صاحب ایک عرصے سے گھٹنوں کے درد میں مبتلا ہیں ، مرزا منور عرق النساء سے مغلوب نہیں ہوئے تھے لیکن جب پروفیسر سلیم صاحب کے لیے چلنا پھرنا دو بھر ہو گیا تو ان کو مخاطب کر کے کہنے لگے -

"آپ نے ابھی سے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں ؟"

بعض لوگ "مرزا" کے سابقے سے ان کو" قادیانی " تصور کرتے تھے - جب کبھی اس قسم کا موقعہ پیدا ہوتا تو مرزا منور کھلکھلا کر ہنستے اور کہتے "میں نے قادیان کے سومنات پر گرز تیموری سے کئی حملے کئے ہیں" - وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مرزائیت کے خلاف ان کے دل میں حقیقی نفرت کا جذبہ مولانا ظفر علی خان کی تقریروں نے پیدا کیا تھا اور اس سلسلے میں وہ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا ذکر کرتے تو گویا دبستان کھل جاتا -"مرزا" کی نسبت سے بھی ایک لطیفہ مدیر" سر راہے" نے رقم کیا ہے جو یوں ہے -

" افغان جنگ کے دوران مرزا محمد منور نے روسی جارحیت کے خلاف بڑی سخت تقریریں کیں - ایک مرتبہ تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ " انشاء اللہ روس کو ذلیل ہو کر افغانستان سے نکلنا پڑے گا" - دوستوں نے پوچھا "کیا یہ آپ کی پیشگوئی ہے ؟"

مرزا منور نے اک تبسم جلی سے کہا " پیش گوئیاں کرنے والے پہلے مرزاؤں کے ساتھ آپ لوگوں نے کونسا اچھا سلوک کیا ہے جو میں یہ سلسلہ شروع کر دوں" پھر کہنے لگے " میری بصیرت بتا رہی ہے کہ روس کو اس جارحیت کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی اور سوویت یونین کی موجودہ صورت باقی نہیں رہے گی" - چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ روس کو افغانستان سے پسپا ہونا پڑا اور سوویت یونین میں کیمونزم کا خاتمہ ہو گیا -

مرزا محمد منور کی اس قسم کی بصیرت کے دو مظاہر اور بھی ہیں -

اول یہ کہ کشمیر انشاء اللہ آزاد ہو گا اور پاکستان کا حصہ بنے گا -

دوم یہ کہ بھارت کا شیرازہ بکھر جائے گا اور یہ ملک تقسیم کے عمل سے گزرے گا -

علامہ اقبال کے بقول" قلندر ہر چہ گوئید دیدہ گوئید" مرزا منور کی یہ پیشگوئی بھی انشاء اللہ ضرور پوری ہو گی - کاش ! خدا یہ روز سعید میری زندگی میں لائے -

# مرزا محمد منور ---- ایک مطمئن مزاح نگار

ڈاکٹر انور سدید

'' میزان اقبال'' اور'' ایقان اقبال'' کے مصنف پروفیسر میرزا محمد منور کے بارے میں اگر یہ بتایا جائے کہ وہ مزاح بھی لکھتے ہیں تو یہ بات شاید بہت سے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے- وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کا ادبی کام اس قدر ثقہ ہوتا ہے کہ انہیں انسان ظریف یا ''حیوان ظریف'' کہتے ہوئے سوچنا پڑتا ہے ، مثال کے طور پر مولانا الطاف حسین حالی یا ابوالکلام آزاد کا نام سنتے ہی آپ عقیدت و محبت سے سر جھکا لینے میں ہی سعادت محسوس کریں گے ، اقبال کے ساتھ ایک ایسی قدآور شخصیت کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ جس کا نام لیتے ہی بے اختیار منہ سے رحمتہ اللہ علیہ نکل جاتا ہے- کچھ یہی کیفیت میرزا منور صاحب کے ساتھ ہے کہ ان کا نام زبان پر آتے ہی ادب و احترام کی فضا خود بخود پیدا ہو جاتی ہے- شاید اس تاثر کی تشکیل کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اس دور ناسپاس میں منور صاحب ایک ذمہ دار استاد بھی ہیں - ایک ایسے استاد جن کی تعریف طلبہ ان کی غیرحاضری میں کرتے ہیں ، اس تعریف کا غالب پہلو یہ ہے کہ میرزا صاحب اپنے طلبہ کو درس ادب عمدگی سے دیتے ہیں - چنانچہ دروغ برگردن راوی ان کی کلاس سے طلبہ غیر حاضر نہیں ہوتے اور اگر کالج میں کوئی چھوٹا موٹا ہنگامہ صرف لہوگرم رکھنے کے لیے بپا کر دیا جائے تو اس میں میرزا صاحب کے شاگرد ان رشید بالکل شریک نہیں ہوتے اور ہموار فطرت کو ناہموار کر کے عامتہ الناس کو اپنے آپ پر ہنسنے یا کم از کم مسکرانے کا موقع نہیں دیتے ، ایسے میں اگر آپ کو بتا دیا جائے کہ میرزا منور نہ صرف مزاح نگار ہیں بلکہ انھوں نے سخن کا یہ اسلوب ۱۹۵۰ء سے اختیار کر رکھا ہے اور وہ مزاح کی ایک اکلوتی کتاب'' اولاد آدم'' کے مصنف بھی بن چکے ہیں مجھے یقین ہے کہ آپ میری طرف حیرت سے ضرور دیکھیں گے اب میرے لیے اور کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ آج کی مجلس میں میرزا محمد منور کے محبوب موضوعات پاکستان ،مسلم لیگ اور اقبال کو چھوڑ کر ان کی مزاح نگاری کے بارے میں آپ سے گفتگو کروں اور اس بات کی توضیح کرنے کی کوشش کروں کہ''

میزان اقبال'' اور'' ایقان اقبال'' میں جو'' انسان ناطق'' آپ سے محوِ تکلم ہے وہی'' اولاد آدم'' میں'' حیوان ظریف'' کے طور نمایاں ہوا ہے اور ان دونوں کے پس پردہ ایک ہی تخلیقی شخصیت میرزا منور موجود ہے -'' میزان'' میں انھوں نے اقبال کے فکر و فن کو اثبات مہیا کیا ہے'' اولاد آدم'' میں انھوں نے اقبال کے معاشرے کو ہی موضوع بنایا ہے- لیکن اب انھوں نے پاسبان عقل کو ذرا آوارہ خرامی کی اجازت بھی دے دی - چنانچہ ان کے ہاں حقیقت کی ناہمواریوں کا شوخ تذکرہ ابھر آیا - جسٹس رستم کیانی نے انہیں پڑھا تو میرزا منور صاحب کو لکھا کہ :

'' قصے بعض اچھے تھے ، پہلے دو تین محض عنداللہ میں نے پڑھے کہ آپ نے بھیجے ہیں - اس کے بعد بستر ے میں لیٹ کر شوقیہ پڑھتا رہا - میں قصے مسودے میں نہیں پڑھتا - چھپے ہوئے اور کتابت اچھی ہو تو پڑھتا ہوں ، بہرحال یہ پڑھ لیے اور دو ایک تو گھر میں بھی سنائے -خصوصاً اس ریلوے کلرک کا قصہ جو بیوی کے حکم سے بکری چراتا تھا اور آخر عقیقے کے بہانے ذبح کر دی ،---- آپ اس کو ضرور چھپوائیں پڑھنے کے قابل صرف نہیں ان سے لطف بھی حاصل ہوتا ہے''-

واضح ہو کہ میں نے کیانی صاحب کی اس تحریر کو اپنے مقدمے کی شہادت کے طور پر پیش نہیں کیا - بلاشبہ یہ ایک بڑے مزاح نگار کا میرزا منور کو بہترین خراج تحسین ہے - تاہم فی الوقت اس اقتباس کا مقصد صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میرزا منور صرف مزاح ہی نہیں لکھتے بلکہ مزاح کی پیشکش کے لیے قصہ بھی تخلیق کرتے ہیں اور اس قصے کو پڑھ کر لطف بھی حاصل ہوتا ہے -ضمناً مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ میرزا صاحب نے ان قصوں میں'' اولاد آدم'' کی ناہمواری پر محبت بھری نظر ڈالی ہے اور انہیں اس فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے پڑھنے والے کو زندگی کا شعور حاصل ہو اور وہ حقیقت کے اس موجود زاویے کو دیکھ کر ہمدردانہ طور پر مسکرا بھی سکے ، چنانچہ میرزا منور کے ہاں حقیقت کا زاویہ نمایاں نہیں ہوتا ، وہ پھکڑ پن کا مظاہرہ نہیں کرتے وہ شخصیت کو توڑنے اور مروڑنے یا اس کا چہرہ بگاڑنے کی کوشش بھی نہیں کرتے بلکہ وہ تو فطرت کی بوالعجبی آشکار کرتے ہیں اور بعض جامد حقیقتوں اور بے لچک کیفیتوں کو دکھا کر آپ کے داخل میں سوئی ہوئی حس مزاح کو بیدار کر دیتے ہیں - چنانچہ ان کے مزاح میں تہذیبی رفعت ہے ، وہ آپ کو سلیقے اور شائستگی سے مسکرانے کی دعوت دیتے ہیں - یہ ایک ایسے مطمئن شخص کا مزاح ہے جس نے زندگی کا مذاق اڑانے کے بجائے اس پر آسودگی کی نظر ڈالی ہے اور اس آسودگی میں اپنے قاری کو

شریک ہونے کی دعوت بھی دی ہے۔

میں اس طویل تمہید کے لیے معذرت خواہ ہوں، ہمارے ہاں مزاح نگاری کو بالعموم بلند مقام نہیں دیا جاتا، بذلہ گوئی، لطیفہ سازی اور حاضر جوابی کو ایک مخصوص قوم کا ورثہ قرار دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ جب بھی کوئی نیا مزاح نگار سامنے آتا ہے تو اس کا رشتہ تخلیق مذکورہ صدر قوم کے ساتھ باندھ کر اسے میدان ادب میں عملی طور پر بھگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ ہمارے ہاں عمدہ مزاح بہت کم تخلیق ہوا ہے اور یوں مزاح سے لطف اٹھانے کا مذاق بھی پیدا نہیں ہو سکا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ کلام میں ظرافت کو وہی مقام حاصل ہے جو کھانے میں نمک کو نصیب ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

> ''یہ مقولہ نہ صرف ایک ادبی صداقت کا اظہار کرتا ہے بلکہ اس عنصر لطیف کا پیمانہ بھی مقرر کر دیتا ہے جس کی آمیزش سے ادب کے چشمہ صافی میں ہلکی ہلکی لہریں اٹھتی اور ذوق سلیم کے لبوں پر موجہ ہائے تبسم میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی زبان کی لطافت اور کسی قوم کی ذہنی پختگی کا اندازہ کرنے کے لیے اس زبان کی ادبی ظرافت اور اس قوم کا احساس مزاح ہی سب سے عمدہ معیار ہے''۔

میں میرزا منور کو ایسے مزاح نگاروں میں شمار کرتا ہوں جنھیں مزاح لکھنے پر ندامت کا احساس نہیں ہوتا اور جو اپنی زبان کی لطافت سے وہ ہلکا سا تموّج پیدا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں جو ذوق سلیم کے لبوں پر موجۂ تموج تبسم کی صورت پھیل جاتا ہے، چنانچہ میرزا منور نے اپنے مضامین کو ''انشائیہ'' کہنے کے بجائے ''نیم مزاحیہ'' کہا ہے اور انھیں کسی اور صنف میں داخل کرنے کی جبری کوشش نہیں کی، انھوں نے درون مزاح رستم کیانی اور سید عبداللہ شاہ کا تذکرہ ادب و احترام سے کیا ہے۔ میرزا صاحب نے ان کا فیض صحبت اٹھایا ہے۔ ان دو شخصیتوں نے مزاح کو ذہنی پختگی کا آئینہ قرار دیا اور اس آئینے میں قوم کو اپنی مضحک صورت دیکھنے کا موقعہ عطا کیا۔ کیانی صاحب کی مجلس آرائیاں تو اب کتابی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ افسوس کہ سید عبداللہ شاہ کی باتیں ہوا میں بکھر گئیں۔ تاہم میرزا منور کو پڑھیں تو بعض مقامات پر تو واقعی یوں محسوس ہوتا ہے کہ منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔ وہ برجستگی وہ خندہ نگاری اور وہ حاضر جوابی جو کیانی صاحب اور سید عبداللہ شاہ میں موجود تھی۔ اس کی روشن کرنیں میرزا منور کے ہاں بھی

صاف نظر آتی ہیں - اور میں اگر یہ کہوں کہ میرزا محمد منور کی مزاح نگاری کا رشتہ بالواسطہ طور پر ہی سہی رستم کیانی اور سید عبداللہ شاہ سے جا ملتا ہے تو شاید وہ خود بھی اس کی تردید نہ کریں اور ان بزرگوں کا نام سن کر فرط عقیدت سے سر جھکا دیں- چنانچہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب ہے کہ میرزا محمد منور کا مزاح مجلسی ہے-

اس میں کوئی شک نہیں کہ مجلسی اور غیر مجلسی مزاح دونوں میں مصنف ناہمواریوں کی طرف ہی متوجہ کراتا ہے تاہم مجلسی مزاح میں مزاح نگار درون کے بجائے خارج بینی کا مظاہرہ زیادہ کرتا ہے- بات سے بات نکالتا ہے اور اکثر اوقات شریک مجلس کی اٹھائی ہوئی بات پر سبقت لے جانے کی کوشش بھی کرتا ہے - میرزا منور صاحب نے جن مجالس میں شرکت کی ہے اس کے بیشتر ارکان سلجھے ہوئے باذوق اور شائستہ ارکان ہیں - میرزا منور صاحب اور متذکرہ ارکان کی عمروں میں بھی خاصا فرق نظر آتا ہے - میرزا صاحب نے ان اصحاب کبیر سے نیاز مندی اور عقیدت کا رشتہ ہی قائم کیا ہے - چنانچہ ان کے ہاں فوقیت حاصل کرنے کے بجائے عاجزی اور انکساری کا زاویہ زیادہ روشن ہے - انھوں نے معاشرے کو ناہمواری پر قہقہہ لگانے کے بجائے اس سے ہمدردی کا رویہ پیدا کیا اور یوں جزو پر نظر ڈالنے کے بجائے معاشرے کے پورے ''کل'' کی نمائندگی کرنے کی کوشش کی-

میرزا منور کے مزاح کی مجلسی جہت کا ذکر آیا ہے تو یہ حقیقت دلچسپی کا باعث ہوگی کہ مرزا صاحب کا اولین مزاحیہ مضمون ''مجلس ترقی تنقید'' ہے اور اس کی تحریک ہی ایک تنقیدی مجلس سے ہوئی ہے اس پر لطف مضمون میں میرزا صاحب نے معاشرے میں برپا ہونے والی تنقیدی مجالس کو ہدف طنز بنایا ہے اور بڑی خوبصورتی سے ان کے ناہموار کناروں کو ابھار کر قاری کو ان مجالس کی ہیئت کذائی پر مسکرانے کا عمدہ موقعہ دیا ہے - مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے - جس میں ''مجلس ترقی تنقید'' کے قواعد وضوابط کی تنسیخ کے لیے دلچسپ جواز تلاش کیا گیا ہے-

> ''جب مجلس ترقی تنقید کی تشکیل ہوئی تھی تو اس وقت اس کے کچھ قواعد وضوابط بھی تھے مگر کچھ مدت کے بعد محسوس ہوا کہ اس سے تنقیدی ذوق عام نہیں ہو رہا - تنقیدی روح پابندیوں کے باعث مرجھائی مرجھائی سی نظر آئی - اس سبزے کی طرح جو کسی بھاری سل کے نیچے اگ رہا ہو، ظاہر ہے کہ ایسا سبزہ ضعیف بھی ہوگا اور زرد رو بھی- لہٰذا ہم نے تمام تر پابندیاں بہبودی تنقید پر قربان کر دیں، یہی باعث ہے

کہ اب ارکان مجلس کے لیے کسی طرح کی کوئی قید نہیں حتیٰ کہ علم کی بھی''۔

یہاں جو سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہو رہا ہے اسے میرزا منور صاحب نے بھی بھانپ لیا ہے اور پھر اس سوال کو تشنۂ جواب بھی نہیں رہنے دیا ۔ چنانچہ لکھتے ہیں ۔

''کسی ناقد کے لیے پڑھا لکھا ہونا کیوں ضروری ہے ؟ یہ سوال ہمارے بہت سے پیدائشی نقادوں کی طرف سے مسلسل اٹھایا جا رہا ہے ، ان کا دعویٰ یہ رہا ہے کہ علم سے تو محض معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے عقل و دانش اور پھر تنقید پر کیا اثر پڑ سکتا ہے، اگر خدانخواستہ علم کا کوئی اثر عقل و دانش پر پڑ بھی سکتا ہو تو ہم پوچھتے ہیں عقل و دانش کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ تنقید کے پھٹے میں ٹانگ اڑائے ۔ اہل مجلس کا اس بات پر بھی ایمان ہے کہ اہل ذوق اور بالخصوص اہل ذوق تنقید بنائے نہیں جاتے وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نہیں گھڑے جاتے ۔ وہ بنے بنائے اور گھڑے گھڑائے نازل ہوتے ہیں یعنی ذوق تنقید لدنی نعمت ہے ۔ اس لیے ہر شخص جسے خدا توفیق دے اپنے وہبی ذوق تنقید کی بدولت یا یوں کہیئے کہ بل بوتے پر تنقید کر سکتا ہے ہے اور جس قدر چاہے اور جس ادب پارے یا مصنف پر چاہے کر سکتا ہے ۔ ہاں اگر وہ بخل سے کام لے تو اس کی مرضی ۔ اس اجتناب کو بعض اہل محفل اگر مہربانی اور عنایت تصور کریں تو یہ ان کی کوتاہ بینی اور تنگ دلی ہو گی -- زوال نعمت پر شکر یہ ادا نہیں کرتے''۔

میں نے عرض کیا ہے کہ میرزا منور بات سے بات نکالنے کے فن میں یکتا ہیں ، چنانچہ جب اہل ذوق تنقید کو علم سے آزادی نصیب ہو گی اور زوال نعمت پر شکریہ لازم ٹھہرا تو میرزا صاحب کی توجہ عام آداب مجلس کی طرف ہوئی اور انھوں نے آزادی عمل و اظہار کو سر بلند رکھنے کے لیے مزید آزادیاں عطا کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ۔ میرزا صاحب اپنے ہموار اور شائستہ بیانیہ میں عطائے آزادی کا یہ پس منظر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں ۔

'' اب تنقید قواعد و ضوابط تو اڑ ہی چکے تھے ، عام آداب مجلس بھی گراں گزرنے لگے۔محسوس کیا گیا کہ آداب مجلس کی پابندی سے روح تنقید پر کچھ اوس سی پڑ جاتی ہے ۔ اس لیے مجلس نے اپنے معزز شرکاء کو اس ضمن میں بھی کھلی چھٹی دے دی ، چنانچہ اب اگر کسی '' مقالہ خوانی '' کے دوران میں کوئی شریک مجلس گنگنا رہا ہو یا خط لکھوا رہا ہو یا پان کا مطالبہ کر رہا ہو یا چنوں سے شوق فرما رہا ہو یا کسی کے کان میں کسی کے خلاف میل ڈال رہا ہو یا خود کسی کن میلیئے سے اپنے کان کا میل نکلوا رہا

ہو تو اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا کہ :

''آج وہ کل ہماری باری ہے''

خوبی کی بات یہ ہے کہ میرزا منور نے اہل ذوق تنقید کو اتنی آزادیاں عطا کرنے کے بعد فساد خلق پر آمادہ کیا ، البتہ اس حقیقت کے اظہار میں بخل سے کام نہیں لیا کہ '' کبھی کبھی ادبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ تو تکار ہو جاتی ہے - گاہے گاہے کسی نقاد کے خلاف بڑے سلیقے سے آستینیں بھی چڑھا لی جاتی ہیں ، ہفتے میں ایک بار'' ناچیز کیا چیز ہے'' کہتا ہوا کوئی ہاتھ کسی گریباں تک بھی رسائی حاصل کر لیتا ہے - بعض تنقیدی دلیلوں کی تائید میں کوئی کرسی بھی کسی فقیر خدا کی مست انگلی کی طرح بڑی بے نیازی سے اٹھ جاتی ہے ، مگر عموماً بیچ بچاؤ سا ہو جاتا ہے اور اہل محفل تقریباً خیریت ہی سے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں اور اگلے روز پھر نئے شوق اور تازہ ولولے کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں - تنقید بھی وہ شراب ہے کہ :

''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی''

مندرجہ بالا اقتباسات میں بلاشبہ میرزا صاحب نے مجلس کا حقیقی چہرہ دکھانے کی کوشش کی ہے - تاہم غور کیجئے تو انھوں نے واقعاتی طور پر اس مجلس کے تضادات کو ہی ابھارا ہے اور یوں ایک شائستہ مسکراہٹ کو بیدار کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے - میرزا منور کے ہاں تضادات کو حقیقت کے بطن سے ابھارنے کا رجحان بے حد نمایاں ہے ، وہ آئینے کو ٹیڑھا کرنے اور عکس کو بگاڑنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ وہ آئینے کو ہموار سطح پر رکھ کر آپ کے سامنے صرف حقیقت کا ایک خوشگوار زاویہ ہی منعکس کرتے ہیں ، اس قسم کی ایک دلچسپ صورت حال انھوں نے اپنے '' باتیں'' جو مجلسی مزاح کا ہی نمونہ ہے پیدا کی ہے لکھتے ہیں :-

'' باتوں کے اکھاڑے کے بعض کرتب دان پہلوان ایسے ہی ہوتے ہیں جو حیران کن و تیرے اختیار کرتے ہیں - بے محل لطیفہ سنا کر با محل مطلب اخذ کرتے ہیں ، بے موقع شعر دے مارتے ہیں اور باموقع تشریح فرماتے ہیں یا کوئی انتہائی نامعقول مقولہ یا ضرب المثل اس اعتماد کے ساتھ جڑ دیتے ہیں گویا سپریم کورٹ کا فیصلہ سنا رہے ہیں ، ہمارے ایک ایم - اے کے ایک رفیق کالجوں کے مباحثوں میں فرضی مصنفوں کے جعلی اقوال بصد آن ، بان ، شان پیش کیا کرتے تھے اور اسی رعب اور اعتماد کے ساتھ کہ مباحثہ جیت لیا کرتے تھے - ایک مباحثے میں کہ '' میں

بھی حاضر تھا وہاں'' انھوں نے بڑے طمطراق سے کہہ دیا کہ'' آپ بے شک جامع اللغات'' دیکھ لیں ''فصیح البیان'' کی ورق گردانی کر لیں'' - فرہنگ قاری'' ملاحظہ فرمائیں'' لغت کبیر'' سے مشورہ کریں آپ پر واضح ہو جائے گا کہ'' فراغت کا معنی عدم مشغولیت نہیں بلکہ فراغت کا معنی ہے - جان بوجھ کر دیدہ دانستہ وقت ضائع کرنا'' ----- اب سمجھے آپ ؟ جامع اللغات کے باقی ناموں کے کونسے اردو لغت ہمارے ہاں موجود ہیں جو ہم ملاحظہ فرمائیں -''

میرزا منور کے مزاح کا دوسرا کامیاب حربہ مزاحیہ کرداروں کی تشکیل ہے ، واضح رہے کہ میرزا منور نے خوجی ، چچا چھکن ، مرزا پھویا اور استاد مینڈ کی جیسے کردار تخلیق نہیں کیے بلکہ انھوں نے ایسے کرداروں کی طرف متوجہ کرایا ہے جو ہماری زندگی میں اور ہمارے معاشرے میں موجود ہیں ، انھوں نے ان کرداروں کی مدد سے اس تضاد کو ابھارنے کی کوشش کی ہے جو ان کرداروں کی عادات اور معاشرے کی عادات میں پیدا ہو چکا ہے،معاشرے کا عمل چونکہ اجتماعی ہے اس لیے وہ معتدل نظر آتا ہے اور کردار کا عمل چونکہ انفرادی ہے اس لیے یہ توازن سے محروم ہے مثال کے طور پر'' یار خوش گفتار'' میں میرزا صاحب نے پروفیسر خواجہ کریم کا نقشہ کھینچا ہے جو طول کلام کے مریض ہیں اور جن کے ساتھ تبادلہ خیال کا انجام عموماً جنگ ہوتا ہے - اسی طرح کا ایک اور کردار پیر علی احمد شاہ ہیں جو پچھتر برس کی عمر کو پہنچ چکے ہیں لیکن بوڑھے نہیں ہونا چاہتے اور اپنی معصومی کی رعایت سے '' ننھے شاہ'' کہلاتے ہیں- کھیل تماشے کے رسیا ہیں - ''طلبگار مرد'' قسم کی فلمیں اور سرکس میں موت کا کنواں ضرور دیکھتے ہیں - بھنگ پیتے ہیں اور ببانگ چنگ پیتے ہیں - ان کا ایک اور دلچسپ کردار حاجی بردار ہیں جو پاکستان ریلوے کے کسی اسٹیشن پر ہیڈ ٹرین کلرک ہیں اور بقول مرزا صاحب غلام زوجہ خان ہیں لیکن اپنی بزدلی یا غلام زوجہ خانی کی واردات پر ہرگز پردہ نہیں ڈالتے ، پردہ ڈالنا تو درکنار اپنی بزدلی کو الٹا بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور یوں اس انداز فکر کے طفیل اپنی بزدلی اور غلام زوجہ خانی کے احساس کو فریب دینے کا اہتمام بالانصرام کر لیتے ہیں - اسی قسم کا ایک کردار'' خوشیا'' ہے جو گھریلو ملازموں کی قوم سے تعلق رکھتا ہے اور ان تمام حربوں کو استعمال کرنے کا طریق جانتا ہے جس سے آقا کو زچ کیا جا سکتا ہے میرزا منور نے اس کردار کا ایک زاویہ ان الفاظ میں بیان کیا :

'' خوشیے کی تنخواہ پچیس روپے مقرر ہوئی تھی - کھانے کے علاوہ اس کے تمبا کو

سگریٹ کا خرچ بھی مجھ ہی کو برداشت کرنا پڑتا تھا - دیگر چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لیے وہ مجھے پریشان نہ کرتا تھا ، سبزی پھل وغیرہ کے خرچ سے بچا بچو کے اپنا کام نکال لیتا تھا ایک روز بڑی ادائے بے نیازی و درویشی کے ساتھ فرمایا -'' چوہدری جی ! ہم آپ کی خدمت کرتے ہیں ،ہمیں کس شے کا غم ہوسکتا ہے - یہ قمیض جس روز پھٹ جائے گی وہ کھونٹی پر سے تمھاری قمیض اتار لوں گا ، نئے تہہ بند کی ضرورت پڑی تو آپ کے بستر کی چادر سے ہی کام چلا لوں گا - جوتا نہ رہا تو آپ کے بوٹوں میں سے کوئی جوڑا اچک لوں گا ، چوہدری جی ہم تو سادھوں لوگ ہیں ، ہم سے تکلف نہیں ہوسکتا -'' میں یہ وعظ استغنا سن رہا تھا اور میرا تبسم میرے ہونٹوں پر بسمل تھا ، دل تحسین شکار میں یہ مصرع محو رقص تھا - ؎

''اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا ''

واضح رہے کہ مزاح نگار کا مقصد محض ہنسی کو تحریک دینا نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کامیاب حربے سے زندگی کی یکسانیت کو توڑتا اور اکثر اوقات معاشرتی مصائب کو بانداز دگر پیش کر دیتا ہے اور یوں بالواسطہ طور پر ان مصائب کی اصلاح کی ترغیب بھی دیتا ہے - میرزا منور کے مزاح میں اصلاح کا یہ پہلو بے حد نمایاں ہے - چنانچہ ان کے مضمون ''مجلس ترقی تنقید'' کا دائرہ اگر ملکی اور سماجی حالات پر پھیلا دیا جائے تو آپ اس میں آسانی وطن عزیز کے موجودہ حالات و کوائف کا مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں اور بعض اوقات تو یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ میرزا منور کا روئے سخن وطن عزیز اور ابنائے پاکستان کی طرف ہی ہے - چنانچہ ان کے ہاں تاسف کی کیفیت بھی موجود ہے ، قدرے ندامت کا عنصر بھی نمایاں ہے اور یہ احساس فراواں بھی کہ اگر صورت حالات یوں ہی رہی تو

''تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں''

اس کاوش میں بلاشبہ میرزا منور نے ناگفتنی کو اپنی شرافت مزاح سے گفتنی بنا دیا ہے- تاہم طنز کی وہ ہلکی سی لہر جو ایسے مقامات پر فی البدیہہ پیدا ہوتی ہے میرزا صاحب کے ہموار لہجے میں بھی نمایاں نظر آتی ہے - خوبی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اس طنز کو چھپایا نہیں - بلکہ چھوٹے چھوٹے عرفانی جملوں سے گرم لوہے پر چوٹ لگانے کی کوشش کی ہے- مثال کے طور پر ان کے چند دلچسپ جملے ملاحظہ ہوں-

''آداب مجلس کی پابندی سے روح تنقید پر اوس سی پڑ جاتی ہے''

''آج کی زندگی نئی زندگی ہے اور وہ ترقی پذیر ہے اس اعتبار سے انسانیت سے بلند

اور رفع ہو چکی ہے''۔

''بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور موضوع بے چارہ یتیم و بے نوا ہو کر رہ جاتا ہے''۔

''سفر کی منزلیں مسافر کو متاثر کرتی ہیں ، بعض مسافر بھی منزلوں کو متاثر کر جاتے ہیں- تاہم میں وہ مسافر نہیں ہوں جس نے منزلوں کو متاثر کیا ہو، ہاں منزلوں نے مجھ پر ضرور اپنے اثرات مرتسم کیے ہیں- انتقاماً میں نے کہیں نشان نہیں چھوڑے'' -

''ہمارے ملک کی آب و ہوا میں دو فصلیں خوب ہوتی ہیں- ایک آقا و دوسری نوکر''

مجھے احساس ہے کہ میں میرزا محمد منور کے مزاح کے چند زاویوں کو ہی اس مضمون میں--- پیش کر سکا ہوں ، انھوں نے صورت واقعہ اور تحریف معنوی سے بھی فائدہ اٹھایا ان کے ہاں لفظ سے رعایت پیدا کرنے کا شائستہ سلیقہ بھی موجود ہے- انھوں نے ہنگامی واقعات کو موضوع بنانے کے بجائے ایسے واقعات کا تذکرہ زیادہ کیا ہے جن کی حیثیت دائمی ہے اور جن سے انسانی فطرت کا کوئی خاص پہلو نمایاں ہو جاتا ہے یہ سب میرزا محمد منور کے مزاح کے روشن زاویے ہیں ، انھوں نے پطرس بخاری کی طرح خالص مزاح کی ایک مختصر اور شائستہ سی کتاب لکھی ہے- یہ کتاب گورنمنٹ کالج لاہور میں پروان چڑھنے والے انداز پطرس کو مزید بلند کرتی ہے-مشکور حسین یاد کے اسلوب میں پطرس کی نفی نہیں کرتی - اس کتاب میں پڑھے جانے اور اپنے گریباں میں جھانک کر فطری مسکراہٹ پیدا کرنے کی عمدہ صلاحیت ہے- تاہم حیرت ہے کہ

> میرزا محمد منور کے اظہار کی اس جہت پر تاحال خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ، شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میرزا صاحب ترقی پسند ادباء کی طرح کسی انجمن ستائش باہمی کے رکن نہیں اور جب کچھ لکھتے ہیں تو ان کا نظریہ صرف یہ ہوتا ہے کہ :
>
> ''صلہ ادیب کیا ہے تب و تاب جاودانہ''

# پروفیسر محمد منوّر -- ایک مردحق آ گاہ

صلاح الدین ایوبی

پروفیسر محمد منور کے بارے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے ہزار بار سوچنا پڑتا ہے کہ ان کی زندگی کے کس پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جائے -

بہ فیض شعلہ ٔ حب نبی منور ہے
میں اس کی ذات میں کیا وسعتیں شمار کروں
خیال و فکر کی فقر و غنا سے زیبائش
میں اس کے سحر سے نکلوں تو آشکار کروں

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنے حصے کا کام نمٹا کر اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں و گرنہ بالعموم انہی لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے جو محض اپنے حقوق بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ کے حصول کی دیوانہ وار جدو جہد میں مصروف کار رہتے ہیں پروفیسر محمد منور ان عالی حاصلہ افراد امت میں سے تھے جو اپنے فرائض ملی سے بخوبی آ گاہ تھے - آپ کی تقاریر اور مضامین کا ایک پسندیدہ موضوع تھا --- الامانت سے الامین تک --- وہی امانت ، حق گوئی اور راست روی کا وہی فریضہ جو یوم ازل انسانیت کے ذمے لگا دیا گیا اور جس کے آئین کی تکمیل خاتم النبین علیہ الصلوۃ والتسلیم کے ذریعے ہوئی - پروفیسر منور آج کے دور میں اس امانت کے امین اور علم بردار تھے اور اپنی پوری زندگی کے ہر ایک لمحے میں وہ اس فرض کی ادائیگی کے لیے کوشاں رہے -

جب فلسفے نے ہمیں علم کے نئے زاویوں سے روشناس کیا اور تشکیک کو پروان چڑھایا تو اپنے اردگرد کے علماء سے بدگمانیوں کی لہر نے جنم لیا - میرے ایک بزرگ نے مجھ سے دریافت کیا --- فلاں مولانا صاحب سے بیزار دکھائی دیتے ہو ، اب کیا کسی اور کو آئیڈیل جان لیا ہے ؟ عرض گزار ہوا کہ حضرت شبلی نعمانی کی ہمہ گیر شخصیت علمی وقار کا اعلیٰ نمونہ ہے - یہ خبر نہ تھی کہ میرے ساتھ کے ڈیسک پر بیٹھ کر ایم اے فلسفہ کا امتحان دینے

والا ، عہد شباب کی رعنائیوں کا مرقع یہ بزرگ شبلی ء زمانہ ہے - یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے ، اس وقت وہ میرے لیے اجنبی تھے ، پروفیسر محمد منور سے میرا ربط و ضبط سات برس بعد شروع ہوا -

حضرات ! آپ میں سے اکثر لوگوں کو یہ علم ہو گا کہ پروفیسر محمد منور نے دور جدید کے چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے کس قدر وسیع پیمانے پر علم کے حصول کی جدوجہد کی - کئی علوم کا سکالر ، کئی زبانوں کا ماہر ، قادر الکلام شاعر ، مقرر اور ادیب ہونا ان کے لیے محض ایک اعزاز نہ تھا ، یہ تو ذریعہ تھا کفر وظلمت کے اس کاروبار مکر کو سمجھنے کا جو دین کی تفہیم اور ترویج کی مساعی میں ایک بارگراں بن جاتا ہے - آج کے اس سائنٹفک دور کے نوجوان کا فلسفہ وفکر کے جن عالمی سرچشموں International Resourses تک رسائی حاصل ہے ، جب تک کوئی مفکر اسلام خود بھی ان تمام علوم سے کماحقہ واقف نہ ہو ، الحاد اور بے دینی کے دھارے کو روک لینا اس کے لیے ممکن نہیں رہتا -

مجھے ادب اور فلسفہ کی تعلیم دینے والے متعدد اساتذہ سے استفادے کے بیشمار مواقع ملتے رہے - حضرت علامہ اقبال علیہ رحمتہ کے افکار کی لاتعداد شرحیں پڑھنے کو ملتی رہیں- اس کے باوجود ایک تشنگی تھی کہ ہمیشہ برقرار رہی - نہ صرف یہ بلکہ اکثر اوقات یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اقبال عالی شان ، وہ حقیقت کا ترجمان ، وہ شارح قرآن جس کے ہم معترف ہیں ، ان سبھی منطقی اور من تکی تحریروں اور تقریروں میں دھندلا سا گیا ہے - یہ عقدہ پروفیسر محمد منور کی سادہ و دلفریب ، یک سو ، یک جہت تحریروں کو پڑھنے اور ان کی تقریریں سننے کے بعد حل ہوا کہ ابلاغ کی وہ تمام تر کوتاہیاں درحقیقت فکر اقبال کے سبھی سوتوں تک نارسائی کا شاخسانہ ہیں -

علامہ اقبال کا منبع علم مولوی میرحسن سے لے کر یورپ کے اعلیٰ ترین اذہان تھے اور ان کا منبع علم تھے <u>قرآن حکیم</u> اور سنت رسول کریم علیہ و علی اصحابہ الصلوۃ والتسلیم ! اب اگر حضرت علامہ کے دور سے لے کر آج تک کے شارحین اقبال کا جائزہ لیں تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی صاحب اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں تو وہ فارسی اورعربی سے نابلد ہیں - اگر انگریزی میں مہارت تامہ حاصل ہے تو تاریخ اور جغرافیے سے کوئی دلچسپی نہیں ، اگر فلسفے سے آشنا ہیں تو سائنسی تحقیقات سے گریز پا ، اگر مطالعے کی وسعت قدرے میسر آ ہی گئی ہے تو شعر سے دلچسپی معدوم ہے - اگر اقبال کے عاشق صادق ہیں تو قرآن وحدیث سے پہلو تہی پر مصر ہیں - ہمارے اردگرد Secular

دانشوروں کا ایک ایسا متحرک اور فعال گروہ موجود ہے جس نے فکر اقبال پر بھی قبضہ کر رکھا ہے - الحمدللہ پروفیسر محمد منور ایک راست فکر Intellectual تھے - قرآن پاک میں دین کے بارے میں انذار یعنی اللہ کی جانب بلانے اور دعوت حق کے لیے فلیتفقھوا فی الدین - اسلام کی مکمل سوجھ بوجھ حاصل کر لینے کی جوکڑی شرط عائد کی گئی ہے' الحمدللہ' پروفیسر محمد منور نے اپنے علم وفضل اور حکمت وبصیرت سے ان منازل کو چھولیا تھا-

میں یہ بات ایک عرصے کی نیاز مندی کے دوران میں پروفیسر محمد منور کے علمی افق کی وسعتوں کو دیکھتے ہوئے پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ علمی اور ادبی میدان میں ایسی ہمہ گیر شخصیت پروفیسر محمد منور ہی کی تھی - وہ عربی فارسی اور اردو کے قادر الکلام شاعر تھے - ان تین زبانوں کے علاوہ انگریزی میں بھی بلا جھجک بولتے اور بے تکان لکھتے تھے - ان سبھی زبانوں کی لغت کے ماہر تھے - وہ سنجیدہ اور فکاہی ادب کے یکساں شناور تھے - قرآن حکیم اور کتب احادیث کے رمز آشنا تھے - تاریخ عالم اور تاریخ اسلام کے واقعات اور سنین تک ان کے ذہن میں انسائیکلوپیڈیا کی طرح محفوظ رہتے تھے -تحریک پاکستان اور قائدین تحریک کے احوال و افکار پر اتھارٹی تھے - فلسفہ و کلام منطق اور نفسیات الٰہیات و مابعد الطبیعیات روحانی اور آفاقی ، طبیعیاتی اور کائناتی علوم سبھی پر حاوی تھے - وہ ایک خطیب بے بدل تھے اور نکتہ فہم ، نکتہ رس مجلسی شخصیت تھے -

پروفیسر محمد منور محض حجرہ نشین عالم متبحر نہ تھے ، جہاں تک بس چلا آپ نے اپنے کسی وہبی علم کو نوجوانوں تک پھیلانے کے لیے مقدور بھر کوششیں کیں - قرآن حکیم کا ارشاد ہے :

الیہ یصعد الکلم الطیب و العمل الصالح یرفعہ (۳۵/۱۰)

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ، نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے منور و تاباں گوشوں کی رونمائی ، توحید و معاد کے تذکرے اور افکار واذکار --- بالآخر اللہ ہی کی جانب صعود حاصل کرتے ہیں تاہم قبول حق کی ایک لازمی شرط ، ایک Prerequisite بھی بیان کر دیا گیا کہ یہ کسی شخص کا عمل صالح ہی ہے جوان کلمات طیبات کو اللہ کی بار گاہ میں پہنچانے کے لیے بلندیاں عطا کر سکتا ہے - پروفیسر محمد منور قرآن کی دعوت کو لے کر ملک اور بیرون ملک ہر جگہ گئے - اپنے علم کو منجمد اور متحجر ---محض کاغذی و کتابی نہیں رکھا ، اسے عمل کے لیے متحرک کرنے والا بنا کر دکھا دیا - اپنے علم کی روشنی کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے انہیں جب بھی اور جہاں بھی جانا پڑا وہ ضرور گئے - بالخصوص ہماری مسلح افواج کے پر عزم

افسروں اور باہمت جوانوں کو نظریہ پاکستان پر راسخ کرنے کے لیے آپ نے درجنوں لیکچر دیئے اور ان میں ہزاروں کتب اور پمفلٹ تقسیم کیے -

علامہ اقبال وہ نابغۂ روزگار ہستی ہیں کہ ان کے ارادت مند انہیں طرح طرح کے القابات سے نوازتے ہیں - کوئی انہیں ترجمان حقیقت کہتا ہے ، کوئی شاعر مشرق ، کوئی مفکر اسلام کہتا ہے تو کوئی شارح قرآن - تاہم ہر طرح کے القابات دے چکنے کے باوجود یوں لگتا ہے کہ بات ادھوری رہ گئی - کچھ یہی معاملہ پروفیسر محمد منور مرحوم کا ہے - ہم جیسے لوگ جنہیں بعض ناواقف احوال لوگ محض اندھا عقیدتمند کہیں گے ، انہیں مرد قلندر بھی کہتے ہیں اور مرد درویش بھی - انہیں صاحب ایقان بھی کہا گیا ہے اور سفیر اقبال بھی - تاہم ان کی راست روی اور راست بازی کے حوالے سے یہ کہنا موزوں تر ہوگا کہ وہ ایک مرد حق آ گاہ تھے - یہ دنیا ڈھل مل یقین اندیشہ و تشکیک سے بھرے افراد سے اٹی پڑی ہے اور اس کی وجہ عیاں ہے کہ مطلوب وطالب ، صادق وصدیق تو کب کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے - اب ان کی صفات کاملہ کی محض ایک جھلک رکھنے والے بھی خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں - جب کبھی کوئی مرد حق آ گاہ اپنے نعرہ مستانہ سے اس کار راز حیات کو گرما دیتا ہے تو کچھ عرصے کے لیے ہی سہی ، نور و نکہت کے جلو میں عطر بیز ہوائیں مشام جاں کو معطر کرنے لگ جاتی ہیں - اس ہجوم مومنین و مومنات کو ایک سچا قائد ، ایک مرد امین مل جائے تو وہ دنیا کے نقشے پر ایک نئے ملک کی سرحدیں اجاگر کر سکتے ہیں - ان کج مج یقین افراد ملت کو کوئی مرد حق میسر آ جائے تو وہ کسی سپر پاور کے اجزاء بکھیر کر رکھ دیں - اور اگر ایک مرد حق آ گاہ مل جائے تو اس کے نوجوانوں میں تذکرۂ قائد و اقبال زندۂ جاوید ہو جاتا ہے، ان کے اذہان میں نظریۂ پاکستان راسخ ہو جاتا ہے، وہ اپنی خودی کو ، اپنے آپ کو شناخت کر لیتے ہیں اور اپنے دشمن کو بھی - پروفیسر صاحب کی الفاظ ہیں :

Iqbal's message in short: "KNOW THY SELF"
and in short Quaid's message is: "KNOW THY ENEMY"

آ گاہی وہی مطلوب ہے کہ جب انسان حقیقت حق سے آ گاہ ہو اور حق آ گاہ ہونے کا مطلب ہے کہ جزو کو ہی نہ پکڑ لے بلکہ کل سے وابستہ ہو جائے - بات بالکل سیدھی اور صاف ہے - دوقومی نظریے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ماننے والے اور دو باتیں یا کروڑوں بتوں کے پجاری الگ الگ قومیں ہیں - ان کے درمیان کوئی اشتراک عمل نہیں ہو سکتا - اس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ تین خداؤں کے ماننے والوں سے آزادی حاصل کر کے سینکڑوں خداؤں کے پجاریوں کو اپنے سر پر مسلط کر دینا

دانشمندی نہیں بلکہ حماقت ہے - تمام باتیں اسی ایک حقیقت کی جانب ہماری رہنمائی کرتی ہیں جسے توحیدی نقطۂ نظر کہتے ہیں - پروفیسر محمد منور مکمل توحید پر کامل ایمان و یقین رکھتے تھے - مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم نے پروفیسر صاحب کی کتاب <u>ایقان اقبال</u> پڑھتے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ آج کے بعد میں آپ کو'' صاحب ایقان'' کے نام سے پکاروں گا---- یہ الگ بات ہے کہ ہمیشہ آگے بڑھنے کی جدوجہد کرنے والے پروفیسر محمد منور کی ذات میں ایمان - ایقان - اور ایقان جنوں بڑھتا چلا گیا -

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں !

پروفیسر محمد منور جب بہ یک وقت دوقومی نظریے کے نقیب ، حضرت قائد اعظم کے ترجمان اور علامہ اقبال کے سفیر بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں تو درحقیقت وہ توحید کے داعی اور علمبردار ہیں - پروفیسر صاحب نے رات کی تنہائیوں میں اپنے رب واحد سے جو تعلق خاطر قائم کئے رکھا ، اس کی بدولت ان کی ذات میں موجود -- نقطہ نورے کہ نام اوخودی است -- اسی نقطہ ء نور کی پرورش ہوتی رہی - انھوں نے اپنی خودی کو پروان چڑھایا اور نقطہ نور کو نور ازل سے اس طرح ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ اب خود ان کی ذات ہم سب کے لیے مینار نور ہے - پروفیسر صاحب نے یہ فضیلت ایک روز میں حاصل نہیں کی - مجھے اس بات کا پورے وثوق کے ساتھ علم ہے کہ ان کے یہ علمی مراتب ان کی سحر خیزیوں کی برکات ہیں -

پروفیسر محمد منور نے جو علم حاصل کیا وہ بھی قابل قدر تھا اور پھر اس علم کے ذریعے تبلیغ کا جو انداز اپنایا وہ بھی مثالی -- <u>قرآن حکیم</u> کا ارشاد ہے :

ادع الی سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنه (۱۶/۱۲۵)

اپنے رب کے راستے کی جانب لوگوں کو حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعے بلاؤ -

پروفیسر محمد منور دوسروں سے جھگڑنے اور لوگوں پر کیچڑ اچھالنے کے بجائے نہایت مثبت انداز میں اپنا کام کرتے چلے گئے - آپ کی طبیعت میں شگفتگی تھی اور آپ ہر آنے والے کا استقبال نہایت خندہ پیشانی سے کرتے - آپ کو اور آپ کے ہم نشین مولانا ابوبکر غزنوی مرحوم کو بھی متکبر اور منقبض طبیعت والے برخود غلط اہل علم سے سخت چڑ تھی - خود پروفیسر صاحب اکثر یہ شگوفہ چھوڑتے کہ ایک صاحب جبہ و دستار پہنے جا رہے تھے - کسی نے پوچھا مولوی صاحب کچھ پڑھے لکھے بھی ہو-- مولوی جی نے تنک کر جواب دیا---

'' پڑھے لکھے نئیں تے ایویں ای سڑے بلے پھر دے آں'' ہمیں کسی کی دل آزاری مقصود نہیں بتانا صرف یہ ہے کہ ایک معلم گو سفنداں ، ایک بوریا نشین فقیر ، ایک معمولی حیثیت کا استاد-- محض اپنی منکسر المز اجی خوش گفتاری اور عوام و خواص سے یکساں چاہت کے ساتھ ملتے رہنے کی بے پناہ خوبیوں کے باعث قبول عام کی سند حاصل کرتا چلا گیا اور ہمیں یقین ہے کہ بارگاہ رب العزت میں بھی وہ شاداں وفرحاں سرفراز و کامران ہو کر گیا ہے-

ہم جیسے متعدد ہیچ میدان ، کج مج زبان طالب علموں کا یہ حال ہے کہ ذرا سی بات پلے پڑ گئی ، کوئی شعر موزوں ہو گیا ، کوئی پیراگراف قلمبند کر لیا تو اپنے جامے میں نہیں رہتے ، میرے مولا ! یہ کیسا شخص ہے جو علم کا بحر ذخار ہے ، ادب و شعر کا آسمان ہے ، فکر کا سائبان ہے لیکن ایسا منکسر المز اج ، ایسا دل موہ لینے والا ! نہ طرہ فرازوں اور جبہ طرازوں کی سی اکڑ ہے نہ علم جدید پر عبور رکھنے کا دعویٰ کرنے والے صاحب بہادروں کا سا کروفر--- عالمانہ وقار ہے ، ادیبانہ طرز اظہار ہے اور ہر پست و بالا سے ہر پیرو جواں سے خاکسارانہ نیاز مندی کے رویے !

پروفیسر محمد منور کی خدمت میں حاضری دینے والوں میں ہر طبقہ فکر کے لوگ شامل تھے، ہر مرتبہ و اہلیت کے لوگ ان سے ملتے اور ان کی بزم سے بہت کچھ لے کر جاتے - پروفیسر صاحب اتنے بڑے علمی و ادبی وقار کی حامل کتابیں اپنے پیچھے چھوڑ کر گئے ہیں جنہیں بجا طور پر Mother Books امہات کتب کہا جا سکتا ہے - بہت سے محققین ان کی زندگی میں ہی در پردہ ان کے خوشہ چین تھے اور آئندہ بھی ماشاء اللہ یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا - ایسی خبریں انہیں بے مزا نہیں کرتی تھیں - فرماتے تھے الحمدللہ کسی نہ کسی طور اسلام کا پیغام ، قرآن حکیم اور علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کا پیغام میرے ذریعے لوگوں تک پہنچ رہا ہے اور پہنچتا رہے گا - یہ نہایت اطمینان بخش بات ہے -

میں نے اپنی آنکھوں سے وہ مناظر دیکھے ہیں جب پروفیسر محمد منور کی خدمت میں سکالر اور دانشور جید علماء اور سجادہ نشین حاضر ہوتے - ہمیں رشک آتا ہے کہ اس شخص پر جس نے اپنی وضع قطع کو عوام سے جداگانہ بنا کر اپنے آپ کو ممتاز کرنے کی کوئی کوشش نہ کی - بلکہ علم کو قرآن سے ہم آہنگ اور اپنے اخلاق کو ائمہ دین کی شان کا پرتو بنانے کی کوشش کرتا رہا - وہ ایک ایسے عالم دین بھی تھے جو جبہ و دستار سے بے نیاز تھا -

پروفیسر محمد منور کی اپنی شخصیت، ان کی اپنی خودی بھی ایک تھی اور وہ ایک الہ واحد کی

جانب ہی مخلوق خدا کو بلاتے رہے - اپنے اس پیغام کو انہوں نے اپنے اخلاق کی خوبیوں سے نمایاں تر کر دیا - بعض شارحین اقبال نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال علیہ الرحمہ ایک نئے علم کلام کے موجد تھے - جب پروفیسر محمد منور کے حضور اس خاکسار نے اس رائے کی تردید کرتے ہوئے یہ کہا کہ میری نظر میں تو علامہ اقبال کو بالآخر کسی فلسفہ و منطق اور علم کلام سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اور وہ خالصتہً رجوع الی القرآن کے داعی ہو کر رہ گئے تھے، تو پروفیسر منور صاحب نے میری اس رائے سے سوفیصد اتفاق کیا - علامہ اقبال نے قرآن حکیم کے بارے میں فرمایا ہے:

ما ہمہ خاک و دل آ گاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست

قرآن حکیم یعنی حبل اللہ المتین سے رابطہ استوار کر لینا ہی اپنے آپ کو زمین کی گرفت سے بلند کر کے اعلیٰ علیین تک لے جانے کا ذریعہ بن سکتا ہے -

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن پاک کے حوالہ سے فرمایا ہے:

ولو شئنا لرفعنه بهاولكنه اخلدالى الارض (۷/۱۷۶)

جو شخص قرآن پاک کی آیات کا منکر ہے گویا وہ معراج انسانی کی منزل کا راہی نہیں بننا چاہتا - وہ تو بس زمین سے چپکتا چلا جاتا ہے، حیوانی سطح سے اوپر اٹھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا - قرآن حکیم کا یہ پیغام ہم نے پروفیسر محمد منور کی زبان حق ترجمان سے بیسوں بار سنا اور ہر بار ایک نئی لذت سے روشناس ہوئے -

ایک عرصہ ہوا، چند نفسیاتی اور طبیعیاتی حقائق کو میں نے شعر کے قالب میں ڈھالا تھا - یہ خبر نہیں تھی کہ اب جب تک سانسیں باقی ہیں یہی کیفیات ہمارا مقدر بنی رہیں گی:

چشم حیرت ہے اور دل ویراں
آدمی وحشتوں کا صحرا ہے
دل پہ قدغن ہے جوئے خوں میں رہے
آنکھ پر آنسوؤں کا پہرا ہے

# محمد منوّر------ چند یادیں

بشیر حسین برلاس

۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا کہ میں محکمہ انہار کے کیرانہ ڈویژن سرگودھا کے ایک سیکشن روڈیانوالہ میں سب انجینئر تعینات ہوا - ہمارے افسر سب ڈویژن کا دفتر لالو والی بنگلہ پر تھا- میں معمول کے مطابق اپنے فیلڈ ورک سے فارغ ہو کر دوپہر کو گھر پہنچا تو میرے خلاصی نے بتایا کہ ایک دیہاتی یہ بتانے آیا تھا کہ نئے ضلعدار صاحب آ گئے ہیں اور وہ پٹواریوں کے کام کی پڑتال کر رہے ہیں - شام کو آپ کے پاس پہنچیں گے - میں نے اپنے خلاصی کو ہدایت کی کہ ان کے لیے بھی شام کا کھانا تیار کر لینا - روڈیانوالہ بنگلہ پر بجلی نہ تھی بلکہ محکمہ انہار کے اکثر بنگلے بجلی کی سہولت کے بغیر تھے - ہمارا معمول تھا کہ سورج غروب ہونے پر نماز پڑھی اور کھانا کھا لیا - لکھنے پڑھنے کا کوئی کام کرنا ہوتا تو مٹی کے تیل کا لیمپ جلا کر کرتے - ہم مغرب کے بعد انتظار کرتے رہے - کچھ دیر کے بعد نئے ضلعدار صاحب تشریف لائے - یہ نئے ضلعدار مرزا محمد منور تھے جو شلوار قمیض کے ساتھ سرگودھا فیشن کی خوبصورت اچکن پہنے ہوئے تھے- سر پر طرے دار پگڑی - جسمانی لحاظ سے دبلے پتلے مگر بارعب شخصیت کے مالک تھے - گفتگو میں بھی سلیقہ تھا - تعارفی گفتگو کے بعد میں نے کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں تو سرگودھے جا رہا ہوں - کھانا گھر جا کر کھاؤں گا - سرگودھا کے ڈویژنل آفس میں کچھ سرکاری کام ہے - چند روز میں وہ نپٹا کر میں یہاں آؤں گا - روڈیانوالہ بنگلہ کو یہ سہولت حاصل تھی کہ تھوڑے فاصلے پر ہنڈے والی ریلوے سٹیشن تھا جہاں سے سرگودھے کے لیے گاڑی مل جاتی تھی - قریب ہی سے سڑک گذرتی تھی جہاں سے سرگودھے کے لیے بس بھی آسانی سے مل جاتی تھی اور سرگودھا کوئی آدھے گھنٹے کا سفر تھا -محکمہ انہار کے بنگلوں پر جو عمارتیں ہوتی ہیں وہ سب انجینئر کی نگرانی میں ہوتی ہیں اور ان کی دیکھ بھال اور مرمت وغیرہ کا کام بھی ان کو کرانا ہوتا ہے - میں نے مرزا صاحب سے کہا کہ آپ اپنا مکان دیکھ لیں تاکہ کوئی مرمت طلب چیز ہو تو میں کروا دوں گا- کہنے لگے آپ خود ہی دیکھ لیں - میں نے اکیلے ہی رہنا ہے - یہ پہلی

ملاقات مختصر سی تھی اور وہ سرگودھے روانہ ہو گئے -

چند روز کے بعد مرزا صاحب آ کر اپنے مکان میں جاگزیں ہوئے - عام سامان تو مختصر تھا البتہ کتابیں زیادہ تھیں جو ان کے طلب علم کے شوق کا پتہ دیتی تھیں - مرزا صاحب اکیلے رہتے تھے - میں بھی اکیلا تھا لہذا پچھلے پہر روزانہ ہی ملاقات رہتی - مرزا صاحب کا مکان ہر وقت کھلا رہتا تھا - رات کو سونے کے وقت پر ان کا خلاصی اندر سے بند کر لیتا ہو گا - میں نے مرزا صاحب کو جب بھی دیکھا مطالعہ کرتے دیکھا - نیند ان کو کم آتی تھی اور نیند کچی بھی تھی - ذرا سی آہٹ پر نیند سے بیدار ہو جاتے تھے - رات کو لیمپ ان کے سرہانے پڑا رہتا - اسے جلاتے اور کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتے -

میں نے ایک دفعہ کہا کہ مرزا صاحب مطالعے کے علاوہ کچھ جسمانی ورزش بھی کر لیا کریں تاکہ دماغ کے علاوہ جسم کو بھی کچھ طاقت ملے تو ہنس کر کہنے لگے کہ ورزش کے لیے بھی تو طاقت کی ضرورت ہوتی ہے - جسمانی لحاظ سے بیشک دبلے پتلے تھے لیکن وہ کم ہمت - کمزور قطعاً نہ تھے بلکہ بڑے سخت جان تھے - کچھ ضلعداروں کا معمول تھا کہ گھر بیٹھے پٹواریوں کے پڑتال کے کاغذات پر دستخط کرتے تھے لیکن مرزا صاحب گرمی ، سردی ، دھوپ میں فیلڈ میں جا کر کام کرتے تھے - دوپہر کا کھانا گھر آ کر کھاتے - کسی زمیندار کے ڈیرے پر کھانا نہ کھاتے تھے حالانکہ بڑے زمینداروں کے لیے یہ اعزاز کی بات تھی کہ سرکاری اہلکار ان کے ڈیرے پر آئیں اور کھانا کھائیں - ان کے اپنے مکان پر کوئی شخص کسی بھی کام سے آتا تو وہ چائے پانی سے ضرور تواضع کرتے -

مرزا صاحب بڑے اچھے گھڑسوار تھے - ایک دن گرمیوں کی دوپہر کو فیلڈ کا کام نپٹا کر واپس گھر آ رہے تھے - راستے میں ایک راجباہ پڑتا تھا - اگر راجباہ کو عبور کر لیا جائے تو دوسرے کنارے پر ان کا گھر تھا اور اگر گھوم پھر کر آیا جائے تو فاصلہ زیادہ تھا - مرزا صاحب گھوڑی کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے لائے - راجباہ کے قریب آ کر گھوڑی کو ایڑی لگائی اور اسے چھلانگ لگوا کر راجباہ پار کر لیا - شام کو انہوں نے مجھے اپنی یہ کارستانی سنائی تو میں نے از راہ مذاق کہا کہ آپ کی بہادری میں تو کوئی شک نہیں لیکن اگر گھوڑی کا پاؤں پھسل جاتا تو گھوڑی اور اس کا سوار دونوں راجباہ میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے -

ہمارے سب ڈویژن کا دفتر لالو والی بنگلہ پر تھا - کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم دونوں کو اپنی تنخواہ لینے کے لیے لالو والی بنگلے جانا پڑتا - یہ بنگلہ ہماری جائے رہائش سے بیس میل کے فاصلہ پر تھا - یہ سفر ہم سائیکلوں پر کرتے اور جانا آنا چالیس میل بنتا - ایک دفعہ تنخواہ لینے

کے لیے ہم دونوں سائیکلوں پر گھر سے روانہ ہوئے ۔ چند ہی میل گئے کہ مرزا صاحب کی سائیکل پنکچر ہو گئی ۔ ہمارے پاس نہ پنکچر کا سامان اور نہ اردگرد کوئی دوکان جہاں سے پنکچر لگوا لیتے ۔ مرزا صاحب کہنے لگے کہ میں سائیکل چلاتا ہوں تم پنکچر سائیکل کو پکڑ کر پیچھے بیٹھ جاؤ ۔ میں نے بتایا کہ مجھے ایسا کوئی تجربہ نہیں اور مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا ۔ پھر میں نے سائیکل چلائی اور مرزا صاحب نے سائیکل کے کیریئر پر بیٹھ کر پنکچر سائیکل کو سنبھالے رکھا ۔ کئی میل تک ہم نے یونہی سفر کیا ۔ قسمت اچھی تھی کہ راستے میں محکمہ انہار کا ایک ڈاکیہ مل گیا ۔ وہ سائیکل پر تھا اور اس کے پاس سائیکل کو پنکچر لگانے کا سامان بھی تھا ۔ اس نے ہماری مشکل حل کر دی اور یوں ہم نے باقی سفر اپنے اپنے سائیکلوں پر طے کیا ۔

اس زمانے میں سب انجینئر اور ضلعدار کی تنخواہ ۹۰ روپے ماہوار تھی ۔ مختلف الاؤنس ڈال کر تھوڑی سی زیادہ بن جاتی تھی ۔ تنخواہ تو معقول ہی تھی اور اخراجات بھی زیادہ نہ تھے لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہم دونوں پر دیگر گھریلو ذمہ داریاں بھی کچھ کم نہ تھیں ۔ ہم لوگ بڑی کفایت سے خرچ کرتے تھے ۔ مرزا صاحب دیانتدار تھے لیکن اپنی دیانتداری کا وقت بے وقت ڈھنڈورا نہیں پیٹتے رہتے تھے ۔ وہ عمل میں یقین رکھتے تھے ۔ ان کے پاس جو بیٹھتا تھا وہ ان کے عمل سے متاثر ہوتا تھا اور ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا ۔

چوہدری شہاب الدین نام کے ایک متوسط زمیندار تھے ۔ میرے ان سے بڑے اچھے مراسم تھے ۔ ایک دن وہ میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ آپ کے مرزا صاحب سے کیسے تعلقات ہیں ۔ میں نے بتایا کہ بہت اچھے ۔ کہنے لگے کہ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ ان سے ہماری سفارش کریں ۔ قصہ یہ تھا کہ بنگلہ روڈ یانوالہ پر ہم دونوں کی تعیناتی سے کافی عرصہ پہلے علاقے کو سیراب کرنے والی نہر ٹوٹ گئی تھی ۔ اس شگاف کو بند کرنے میں گاؤں کے لوگوں نے بھرپور مدد کی ۔ بعد میں اس وقت کے سب انجینئر اور ضلعدار نے اپنے کارندوں کے ذریعے ان سے کچھ رقم کا مطالبہ کیا جسے پورا کرنے سے گاؤں والوں نے انکار کر دیا ۔ اس پر ان دونوں نے یہ رپورٹ بنائی کہ گاؤں والوں نے اپنی زمینوں کی ناجائز آبپاشی کے لیے مذکورہ نہر کو خود کاٹا جو جرم تھا ۔ گاؤں والوں کو اب پتہ چلا کہ محکمہ نے ان پر تیس ہزار روپے تاوان کی رقم ڈال دی ہے ۔ چوہدری شہاب الدین چاہتے تھے کہ اگر ان کو اس بڑی رقم کی ادائیگی سے بچا دیا جائے تو وہ دس ہزار روپے اس کام کے لیے پیش کرنے کو تیار ہیں ۔ میں نے ان کو بتایا کہ مرزا صاحب تو ایسا کام ہرگز نہ کریں گے ۔ ان کا اصرار تھا کہ میں مرزا صاحب سے بات تو کروں ۔ میں نے

سارا معاملہ مرزا صاحب کے گوش گزار کر دیا - کہنے لگے کہ اگر وہ سچے ہیں اور مظلوم ہیں تو ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے -مختصر یہ کہ انہوں نے بڑی کاوش کے بعد ڈویژنل آفس سے فائل منگوائی جو کاروائی کے اپنے آخری مراحل میں تھی - ہم دونوں وہ جگہ دیکھنے گئے جہاں سے نہر ٹوٹی تھی تو پتہ چلا کہ جس طرف سے نہر ٹوٹی تھی وہاں تو چوہوں نے بیشمار بل بنا رکھے تھے - زیادہ امکان یہی تھا کہ کسی وقت نہر کا پانی ان بلوں میں داخل ہو گیا ہو جو نہر کے ٹوٹنے کا سبب بنا ہو - اپنے طور پر پرانے ملازموں اور دیگر افراد سے بھی معلوم کیا - جب یہ یقین ہو گیا کہ گاؤں کے لوگ بےقصور ہیں تو مرزا صاحب نے پہلی رپورٹ کی پشت پر اپنی رپورٹ لکھ دی اور چوہدری شہاب الدین کو تاکید کر دی کہ اگر محکمہ انہار تاوان کے سلسلہ میں پریشان کرے تو گاؤں والے اس معاملہ کو سول عدالت میں لے جائیں - یہ نئی رپورٹ ان کو بےقصور ثابت کرنے میں بہت مدد دے گی - اس ساری کاروائی پر چوہدری شہاب الدین اور گاؤں کے لوگوں کا ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہوا - اگرچہ ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا اس کیس کا انجام کیا ہوا کیونکہ تھوڑے عرصہ بعد ہی مرزا صاحب وہاں سے تبدیل ہو گئے اور میں بھی تبدیل ہو کر ایک دور دراز علاقے میں چلا گیا تاہم یہ یقینی بات ہے کہ جن سرکاری ملازمین نے محض اپنے لالچ کی خاطر گاؤں کے لوگوں کو عذاب میں ڈال دیا تھا وہ عذاب ضرور ٹل گیا ہو گا -

مرزا صاحب نے حصول رزق کے لیے کئی ایک جگہ کام کیے لیکن کوئی دل کو لگا نہیں- ضلعدار کا منصب بھی کوئی معمولی نہ تھا مگر وہ بھی پسند نہ آیا - ایم اے کرنے کے لیے اورئینٹل کالج میں آ گئے - پھر گورنمنٹ کالج لائلپور (موجودہ فیصل آباد) میں پروفیسر ہو گئے - پروفیسری ان کو شوق مطالعہ کی وجہ سے پسند تھی - مجھے معلوم تھا کہ مرزا صاحب قبل ازیں کئی ملازمتیں چھوڑ چکے تھے لہٰذا ایک ملاقات کے دوران میں نے پوچھا کہ اب پروفیسری کو کب چھوڑنے کا ارادہ ہے - کہنے لگے اب میں تو اس کو نہیں چھوڑوں گا - یہی مجھے چھوڑے گی - مذکورہ کالج کے پرنسپل پروفیسر کرامت حسین جعفری تھے جو فلسفہ کے استاد تھے اور مرزا صاحب کا ان سے کافی تعلق تھا -ممکن ہے یہ ان کی صحبت کا اثر ہو کہ مرزا صاحب نے فلسفہ میں ایم - اے کرنے کی ٹھان لی اور اس مضمون سے متعلق کتابیں جمع کرنی اور پڑھنی شروع کر دیں - کچھ عرصے بعد لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب ایم - آر - کیانی صاحب کی خواہش پر محکمہ تعلیم پنجاب نے مرزا صاحب کو فیصل آباد سے گورنمنٹ کالج لاہور تبدیل کر دیا - یہاں کی مصروفیت کی وجہ سے چند سالوں کے لیے

فلسفہ کی کتابیں ٹھپ ہو گئیں - مرزا صاحب اچانک مرض عرق النساء میں مبتلا ہو گئے - ٹانگ میں درد اتنا ہوتا کہ شدت درد سے ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا مگر زبان سے اف تک نہ کرتے تھے - معالج کی ہدایت پر علاج کے ساتھ سخت بستر پر لیٹنا ضروری ٹھہرا - یہ عرصہ کچھ طویل ہو گیا - اسی دوران مرزا صاحب دوبارہ فلسفہ کی کتابوں کی طرف متوجہ ہوئے اور امتحان میں بیٹھنے کے لیے داخلہ جمع کرا دیا - ایم -اے کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے - مرزا صاحب میں ذاتی تکلیف کو برداشت کرنے کی ہمت بہت تھی - بیماری کے دوران واویلا نہیں کرتے تھے - خاموش رہتے تھے صرف چہرے سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کرب کی حالت میں ہیں - اس بیماری نے مرزا صاحب کو ایم - اے کی ڈگری تو دلا دی مگر ساتھ ہی ایک ٹانگ سے لنگڑا بھی کر دیا - ایک پاؤں دبا کر چلنے لگے - زندگی کے آخری ایام میں بھی جبکہ وہ شدید تکلیف میں مبتلا تھے اور بیماریوں نے ہر طرف سے یلغار کر رکھی تھی ان کے منہ سے میں نے صرف اللہ اکبر کی آواز ہی سنی - انہوں نے اپنی بیماری کی شدت تکلیف کا ذکر نہ کیا -

مرزا صاحب اپنے ملنے والوں کے دکھ سکھ میں شریک رہتے تھے - ضرورت مند کی حسب توفیق مدد بھی کرتے تھے - طلبا کی امداد کے لیے خصوصی طور پر کمربستہ رہتے تھے - ایک انجینئرنگ کے طالب علم تھے جن کی وہ ماہوار مالی امداد کرتے رہے اور اسے کہا کہ یہ قرض ہے جو تم نے برسر روزگار ہو کر ادا کرنا ہے - وہ نوجوان تعلیم مکمل کر کے برسر روزگار ہوا تو اس نے مرزا صاحب سے رابطہ کر کے قرض کی رقم ماہوار اقساط میں واپس کرنا چاہی - مرزا صاحب نے کہا کہ یہ درست ہے کہ وہ رقم تم پر قرض تھی - اس قرض کو اتارنے کا طریقہ یہ ہے کہ جیسے میں نے تمہاری مشکل میں مدد کی اسی طرح تم بھی کسی ضرورت مند کی مشکل میں مدد کرو اور نیکی اور اچھائی کی شمع کو جلائے رکھو -

گزشتہ پچاس سالوں میں مرزا صاحب کی وفات تک صرف چند برس ایسے گزرے کہ ہم بسلسلہ ملازمت ایک دوسرے سے دور رہے ورنہ زیادہ عرصہ ہم ایک دوسرے کے قریب ایک ہی علاقہ یا ایک ہی محلّہ میں رہائش پذیر رہے لہٰذا مجھے ان کو دیکھنے اور جاننے کے زیادہ مواقع حاصل رہے - اگرچہ عمر میں وہ مجھ سے صرف تین سال بڑے تھے لیکن جوانی میں ہی بڑے سمجھدار اور عقلمند تھے - غالبًا اس کی وجہ یہ ہو گی کہ ان کے دوست بزرگ لوگ تھے جو ان سے عمر اور تجربہ میں بہت زیادہ تھے - ان بزرگوں میں قریشی عبداللہ شاہ ، ابوالاثر حفیظ جالندھری اور راجہ حسن اختر جیسے اصحاب شامل تھے - مجھے ایک

دفعہ راجہ حسن اختر صاحب سے ملنا تھا تو میں نے مرزا صاحب سے تعارفی خط کی فرمائش کی - انہوں نے ایک چھوٹے سے کاغذ پر اپنے ہاتھ سے شعر لکھ کر دیا :-

جو ہو راجہ اس کے پاس
پرجا آئے لے کے آس

اور کہا کہ راجہ صاحب کو یہ رقعہ پیش کرنا اور اپنی بات کہہ لینا - میں نے راجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر وہ رقعہ آگے رکھ دیا - شعر پڑھ کر زیرلب مسکرائے اور میری بات کو بغور سنا -

ذاتی نقصان یا صدمے کو وہ بڑے حوصلے سے برداشت کرتے تھے بلکہ ایسے نقصان کا ذکر بھی نہیں کرتے تھے البتہ پاکستان - مسلم لیگ اور قائد اعظم سے متعلق نازیبا الفاظ یا مخالفت برداشت نہ کرتے تھے- ایک سیاسی جماعت کے نظریات سے ان کو سخت اختلاف تھا- جب وہ پارٹی برسر اقتدار تھی اور مرزا صاحب خود گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر تھے تو سٹیج پر ایسی تقریریں کرنے لگے جو حکومت کو پسند نہ تھیں - میں نے عرض کیا کہ جناب آپ سرکاری ملازم ہیں اپنی جان کے دشمن کیوں بن رہے ہیں تو کہنے لگے کہ یہ پاکستان کا معاملہ ہے - تم چاہتے ہو کہ میں اپنی نوکری بچانے کے لیے ملک پر کلہاڑا چلتے دیکھتا رہوں اور خاموش رہوں - نوکری سے نکال دیں گے تو ریڑھی لگا کر گنڈیریاں بیچ لوں گا - وہ اپنے کام میں لگے رہے اور خاموش نہ ہوئے - وہ اکثر اپنے گہرے اور بے تکلف دوست پروفیسر خورشید عاصم کے پاس حسن ابدال جایا کرتے تھے - عاصم صاحب کیڈٹ کالج حسن ابدال میں پروفیسر تھے - میرے برادر نسبتی ڈاکٹر سکندر حیات خان اسی کالج میں جز وقتی میڈیکل آفیسر تھے - پہلی بار جب مرزا صاحب کی ملاقات ڈاکٹر سکندر حیات خان سے ہوئی تو واپس آنے پر مجھ سے ملاقات کا ذکر کیا - مجھے ذرا پریشانی ہوئی کیونکہ ڈاکٹر صاحب مذکور اسی پارٹی سے دلچسپی رکھتے تھے جس سے مرزا صاحب کو نفرت تھی - میں نے رات کو حسن ابدال فون کر کے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ مرزا صاحب سے اپنی پارٹی وغیرہ سے متعلق کوئی بات نہ کرنا ورنہ تم مشکل میں پڑ جاؤ گے - اگلے دن میں نے مرزا صاحب کو بھی بتا دیا - کہنے لگے اچھا کیا - وہ نوجوان ڈاکٹر پرجوش ہے - خواہ مخواہ بدمزگی پیدا ہوتی -

محکمہ انہار سے فارغ ہونے کے بعد میں کام کی تلاش میں تھا - نیشنل فرٹیلائیزرز کارپوریشن میں جناب فقیر اعجاز الدین صاحب جنرل منیجر فنانس تھے ان کا ایک یونٹ پاک سعودی فرٹیلائیزر کے نام سے میرپور ماتھیلو سندھ میں زیر تعمیر تھا - چوہدری محمد اقبال منیجر

سول ورکس اکاؤنٹس تھے - وہ مستند اکاؤنٹینٹ ہونے کے ساتھ ایک لائق انجینئر بھی تھے - انہیں ایک مدد گار کی ضرورت تھی - یہاں سول انجینئرنگ کے علم اور تجربہ کے ساتھ قانون کی اضافی تعلیم میرے کام آئی - چوہدری اقبال صاحب نے میری سفارش کی اور فقیر اعجاز الدین صاحب نے میری سیلیکشن کر لی - اقبال صاحب نے مجھے اپنے شعبہ میں رکھ لیا - میں تقریباً ۱۲ سال شعبہ حسابات میں کام کرتا رہا - وہاں ریٹائرمنٹ کی عمر ۶۰ سال تھی - ایک دن باتوں باتوں میں مرزا صاحب نے پوچھا کہ ریٹائر کب ہو رہے ہو - میں نے بتایا کہ مئی ۱۹۸۷ء میں ریٹائرمنٹ ہو گی اور بات آئی گئی ہوئی - تقریباً ۶ ماہ بعد میں ڈپٹی مینجر اکاؤنٹس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر لاہور آ گیا - گھر کے دیگر کام کاج میں ایسا مصروف رہا کہ ہفتہ بھر مرزا صاحب سے ملنا ہی نہ ہوا - ایک دن عزیزم سید یوسف عرفان گھر آئے اور اہلیہ کو پیغام دے گئے کہ برلاس صاحب آ گئے ہوں تو مرزا صاحب نے یاد فرمایا ہے - اگلے روز میں حاضر ہوا - علیک سلیک کے بعد کہنے لگے کہ آئے ہو تو ملے نہیں - کیا میر پور ماتھیلو سے فارغ ہو کر آئے ہو ؟ میں نے اثبات میں جواب دیا - پھر پوچھا کہ اب کیا ارادہ ہے - دال روٹی کیسے چلے گی ؟ مکان کا کرایہ کہاں سے دو گے ؟ میں نے جواب دیا کہ اللہ ہی کو معلوم ہے - کہنے لگے چلو میرے ساتھ اور اقبال اکیڈمی میں کام شروع کر دو - اس وقت وہ ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی تھے - میں حیران تھا کہ ان کو ۶ ماہ پہلے کی بات یاد تھی کہ میں مئی میں فارغ ہو جاؤں گا - یوں میں اقبال اکیڈمی کی خدمت میں مصروف ہو گیا - میں نے شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے کہ تمہارے مالی حالات کا میں بھی کچھ ذمہ دار ہوں کیونکہ تمہاری تربیت میں میرا بھی حصہ ہے ورنہ میں جانتا ہوں کہ تمہارے کئی ''پیٹی بھرا'' اس وقت کوٹھیوں کے مالک اور کاروں میں گھوم رہے ہیں - میں نے اب تک تمام عمر کرایہ کے مکان میں گزاری ہے - مرزا صاحب بھی اپنے لیے کوئی مکان نہ بنا سکے - میں کبھی اپنی پریشانی کا اظہار کرتا تو بڑے اطمینان سے کہتے کہ میں جو تم سے کافی زیادہ تنخواہ لیتا رہا ہوں اپنے لیے مکان نہیں بنا سکا تو تم محض اپنی تنخواہ میں سے مکان کیسے بنا سکتے تھے - جو تنخواہ دار یہ کام کرتے ہیں ان کے وسائل جائز یا ناجائز زیادہ ہوتے ہیں - تنخواہ میں تو باعزت گزارا کرنا بھی مشکل ہوتا ہے - اللہ کا شکر ادا کیا کرو کہ اس پردہ پوش مالک کی رحمت سے تم بغیر مکان کے تو نہیں رہے - یوں وہ زندگی کے روشن پہلو کی طرف توجہ دلاتے اور حوصلہ بڑھاتے تھے - مرزا صاحب جب تک اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر رہے ان کی کچھ رقم میری تحویل میں رہی - انہوں نے مجھے کچھ اڈریس دیئے

ہوئے تھے کہ ہر ماہ اتنی اتنی رقم ان کو بھیج دیا کرنا - میں ان کی اس خواہش کی تعمیل کرتا رہا-

مرزا صاحب کی زندگی کے آخری دو اڑھائی سال تو سخت بیماری میں گزرے -تقریباً بستر پر ہی رہے - سیر کرنے سے بھی قاصر تھے - ملنے والے گھر پر ہی آ کر ملتے تھے - چند ماہ تو ہسپتالوں میں ہی گزرے - میں عموماً حاضر ہوتا رہتا - چند روز میں نہ جا سکا - جب گیا تو نہ آنے کی وجہ پوچھی میں نے بتایا کہ اہلیہ بیمار ہے - پتے میں پتھریاں ہیں - ٹیسٹ وغیرہ کروانے میں مصروف رہا - کہنے لگے ان کا آپریشن کروا لو - میں خاموش رہا - کہنے لگے مجھ سے رقم لے لو اور جلد آپریشن کرواؤ - وہ میری بہن ہے - یہ رقم تم قرض سمجھ لینا - ممکن ہوا تو لوٹا دینا ورنہ نہ دینا - میں نے کہا کہ مرزا صاحب ابھی آپریشن کا ارادہ نہیں اس لیے رقم کی ضرورت بھی نہیں - ایسی سوچ اس شخص کی تھی جو خود موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا اور اس کے اپنے علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا - آہستہ آہستہ بیماری کے سبب ان کی بھوک ختم ہوتی گئی -جسم لاغر ہو گیا - چلنے پھرنے سے بالکل عاری ہو گئے- ایک شام گیا تو پروفیسر خورشید عاصم کی وفات کی خبر سنائی - وہ ان کے پرانے - بے تکلف اور گہرے دوست تھے - ایم - اے کے دوران اورئینٹل کالج میں اکھٹے رہے تھے - ان کے انتقال کا مرزا صاحب کو شدید صدمہ پہنچا کہنے لگے کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ہمارے درمیان موت حائل ہو جائے گی - بیماری بڑھتی چلی گئی - ایک دن حال پوچھا تو کہنے لگے کہ اب تو کوئی معجزہ ہی ہو تو ممکن ہے بچت ہو جائے -میرا بیٹا ڈاکٹر نعمان بھی دیکھنے جاتا تھا - اس کو کسی صاحب نے بتایا کہ بیماری سے شفاء کے لیے مرزا صاحب یہ تسبیح پڑھیں - مجھے کہنے لگے کہ مجھ میں تو اب ہمت نہیں - میں نے کہا کہ کوئی بات نہیں میں پڑھ لیا کروں گا - رفتہ رفتہ نیم بہوشی کی کیفیت طاری رہنے لگی - اتوار کا دن تھا -صبح میں دیکھنے گیا تو خاموش لیٹے تھے -تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر محمد شاہ آ گئے -عزیزم صلاح الدین بھی آ کر بیٹھ گئے - ہم سب مرزا صاحب کی حالت دیکھ کر پریشان تھے صلاح الدین صاحب کہنے لگے کہ ڈاکٹر صفدر محمود صاحب سے بات ہوئی ہے - مرزا صاحب کو کل میوہسپتال داخل کرانے کا پروگرام ہے - رات کو میرا بیٹا ڈاکٹر نعمان دیکھنے گیا - واپس آنے پر اس نے مایوسی کا اظہار کیا - اگلے دن مرزا صاحب فانی دنیا کو چھوڑ کر آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے - کل نفسٍ ذائقة الموت - اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے -

سورہ عصر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ زمانے کی قسم ، انسان درحقیقت خسارے میں

ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، اور نیک اعمال کرتے ہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے - میں سمجھتا ہوں کہ مرزا صاحب اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ صفات کا ایک اچھا اور قابل تقلید نمونہ تھے - ان کے قول وفعل میں یکسانیت ہوتی تھی - اگرچہ وہ اسی مادی دنیا کے باسی اور ضروریات زندگی کے حاجتمند انسان تھے لیکن ان کے بقول فکر ونظر ہم آہنگ نہ ہوں اور نظریہ وعمل میں مطابقت نہ ہو تو آدمی خواہ کسی بھی کمال کا مالک ہو وہ محض ایک خوش پوش اور خوش گفتار دو پایہ ہے- اتنے سالوں کی قربت اور عمروں میں معمولی سے تفاوت کے باوجود میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ میرے دوست تھے اور ہم میں بے تکلفی کا رشتہ موجود تھا - میرے لیے وہ مہربان -شفیق اور بڑے بھائی کی طرح تھے جو ہر آڑے اور مشکل وقت میں میری پشت پر ہوتے تھے - ان کے جانے سے میں ایک راست گو اور مشفق نگران سے محروم ہو گیا ہوں - جانا تو سب کو ہے لیکن دنیا میں آنے کا حق ان لوگوں نے ہی ادا کیا جو راہ راست سے نہیں بھٹکے اور جنہیں جانے کے بعد لوگوں نے اچھے نام سے یاد کیا -

# استاد المکرّم پروفیسر محمد منور
# کا
# سفر آخرت

سید یوسف عرفان

پروفیسر محمد منور کی شخصیت کی کئی جہات ہیں اور ہر جہت ایک تفصیلی تحریر کی متقاضی ہے- موصوف ایک خوش ذوق شاعر اور ایک عمدہ نثر نگار تھے - آپ نہ صرف ایک اعلیٰ پائے کے مقرر تھے بلکہ ایک بلند پایہ محقق اور مورخ بھی تھے - آپ بیک وقت اردو ، انگریزی ،عربی اور فارسی کے شاعر اور ادیب تھے - آپ کی علمی اور تحقیقی کاوشات کا محور و مرکز صرف اسلام اور پاکستان تھا - آپ کی محبت و نفرت انہی دو حوالوں سے مزین تھی - رسول خداﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ'' الحب للّٰہ و البغض للّٰہ''- آپ کا رویہ، مزاج اور طرز عمل اسی حدیث شریف کی تفسیر ہے - آپ اسلام دشمن اور پاکستان کے مخالفین کے لیے ایک شمشیر برہنہ تھے - پروفیسر منور صاحب کی علمی تحقیقی ،شعری اور تحریک پاکستان کے حوالے سے تحریروں پر لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے - راقم منور صاحب کی ذاتی شخصیت کے حوالے سے چند باتیں رقم کرے گا -

راقم کا قبلہ منور صاحب سے تقریباً (۳۰) تیس برس کا ساتھ تھا - راقم جب پانچویں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا ، اس وقت سے پروفیسر منور صاحب کی صحبت سے مستفید ہونے کا اعزاز میسر ہے - راقم نے منور صاحب کی صحبت میں جتنا وقت گزارا ہے وہ گھر کے افراد کے سوا ،کسی اور کو نصیب نہیں ہوا -

پروفیسر محمد منور صاحب ایک مصفی قلب کے مالک تھے - آپ کا دل ایک ایسا آئینہ تھا جس میں موجود ہر نقش صاف اور نمایاں تھا - آپ کو منافقت اور ریاکاری سے شدید نفرت تھی - سادگی اور انکساری آپ کی شخصیت کا خاصہ تھی - آپ زندگی بھر نہ کسی عہدے سے مرعوب ہوئے اور نہ کسی عہدے دار سے خائف -حق گوئی و بیباکی آپ کے مزاج کا جزو لاینفک تھی -

محترم پروفیسر محمد منور صاحب کے آخری ڈیڑھ دو سال بستر علالت پر گزرے جبکہ

اس دوران آپ سات آٹھ ماہ ہسپتالوں میں رہے ۔ --- قبلہ منور صاحب ہسپتال کو اذیت خانہ کہا کرتے تھے ۔ کسی عزیز کی ہسپتال جا کر عیادت کرنا منور صاحب کے لیے تکلیف دہ عمل ہوتا تھا ۔ مگر جب وہ خود ہسپتال پہنچے تو اسی کو رضائے الٰہی جان کر خاموشی اختیار کر لی اور کہا کہ اگر یہی میرے مولا کی مرضی ہے تو یوں ہی سہی ---- ہسپتالوں میں خاصے تکلیف دہ دور بھی گزرے مگر آپ نے یہ دور بھی ہمیشہ ہنس کے گزارے کبھی کسی تکلیف کا رونا نہیں رویا ۔ موت کا استقبال بھی مسکرا کر کیا ہے --- زندگی کا ہر لمحہ گو مرزا صاحب نے بھلے دنوں میں بھی ہر لمحے کو زندگی کا آخری لمحہ جان کر گزارا ہے مگر زندگی کے آخری دور میں حضور قلب کی یہ کیفیت تھی کہ جیسے زندگی ہر لمحہ خدا کے حضور حاضری کا لمحہ ہے ۔ اس دور میں آپ خاموشی کے ساتھ درود وظائف پڑھتے رہتے تھے ۔ نیز اپنی ہمت و صحت کے مطابق اللہ ، رسول ﷺ قائد اعظم ،علامہ اقبال ، پاکستان اور اسلام کے موضوعات پر گفتگو کرتے تھے اور ان موضوعات پر گفتگو سن کر بھی بہت خوش ہوتے تھے اور سامعین کو تھوڑی دیر کے لیے یہ احساس ہوتا تھا کہ مرزا صاحب بالکل تندرست ہیں--- اس دور میں مرزا صاحب اپنے مرحوم احباب عبداللہ شاہ قریشی ایڈووکیٹ (سرگودھا) محمد سعید بٹ ، شیخ عبدالشکور اور اپنے ولی اللہ بزرگ دوست ڈاکٹر نذیر احمد قریشی صاحب کا ذکر بڑی محبت اور رقت سے کرتے تھے ---- قبلہ منور صاحب علالت کی طوالت کے باعث اپنے قریب ترین دوستوں سے کہتے تھے کہ خدائے بزرگ و برتر ہر شے پر قدرت کاملہ کا حامل ہے --- خدا کے حضور دعا کریں کہ وہ جلد کوئی فیصلہ فرمائے ۔ وہ ڈوبی کشتی بھی کنارے لگا سکتا ہے ۔ اگر زندگی ہے تو صحت بھی عطا کرے وگرنہ آر یا پار کا حکم صادر فرمائے ۔ مجھے موت کا خوف نہیں ہے ۔ البتہ اذیت اور اپنوں کی بے بسی ایذا کا باعث ہے۔ خدا اس عجز کی کیفیت کے بغیر بھی فیصلہ نافذ کر سکتا ہے ۔ (نماز جنازہ کے وقت راقم کو سابق مرکزی سیکریٹری مذہبی امور جناب مفتی لطف اللہ صاحب نے بتایا کہ مرزا صاحب اور میرے مشترکہ دوست جناب میجر امیر افضل نے بتایا کہ وہ عرصے سے مرزا صاحب کے لیے تہجد کے وقت بلاالتزام دعائے صحت فرماتے تھے ۔ مگر کچھ عرصے سے امیر افضل صاحب کی کیفیت یہ تھی کہ وہ جب بھی مرزا صاحب کی صحت کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو ایک بادل سا سامنے آ جاتا تھا ۔ جس کا مفہوم واضح تھا ) پروفیسر منور صاحب نے راقم کو آخری دور میں جو دعائیں دیں ان میں سے ایک دعا یہ بھی تھی ۔ ''ٹوٹم ! (راقم کا پیار کا نام) خدا تمہاری حیات و ممات آسان رکھے ۔ تکلیف اور اذیت سے پاک صاف

رکھے''-

پروفیسر منور صاحب کے لیے عمر بھر شعور حیات ایک عظیم نعمت خداوندی تھی - لہٰذا آپ موت کے آخری لمحے تک شعور حیات سے ہر دوصورت لطف اندوز ہوتے رہے- مگر زبان سے ہمیشہ حمد و ثنا کے پھول جھڑتے تھے - قبلہ منور صاحب کو معلوم تھا کہ اب وقت آخر ہے اور آپ نے اس وقت آخری سفر کی تیاری بھی بڑے اہتمام اور ابتسام کے ساتھ کی تھی - محترم منور صاحب کو اپنے عزیز ترین دوستوں میں سے محمد سعید بٹ ایڈووکیٹ کی موت کی تیاری بہت پسند تھی --- محمد سعید بٹ صاحب اپنے چند دوستوں کے ساتھ شمالی علاقے کی سیر کے لیے شوگران گئے ہوئے تھے کہ انہیں ہوٹل کے کمرے میں شدید قسم کا دل کا دورہ پڑا - انہوں نے اپنے دوست میاں محمد صدیق صاحب سے دل کی دوا لانے کے لیے کہا مگر انہیں یہ محسوس ہو گیا تھا کہ اب وقت نہیں ہے - سعید بٹ صاحب نے دوا آنے سے قبل با آواز بلند تین بار تکبیر کہی اور جان خالق حقیقی کے حوالے کر دی پروفیسر محمد منور صاحب عمر بھر محمد سعید بٹ صاحب کی ایسی موت پر (ایسے وصال پر ) رشک کرتے تھے --- قبلہ منور صاحب نے اپنے آخری لمحوں میں چار بار تکبیر اللہ اکبر، اللہ اکبر، کہہ کر خدائے عظیم و برتر کے حضور جان دی - مرزا صاحب قبرستان میانی صاحب میں مسجد عمر بن عبدالعزیز سے ملحق ڈاکٹر نذیر احمد قریشی صاحب اور محمد سعید بٹ صاحب کے پہلو میں دفن ہیں - نیز مرزا صاحب کی قبر اس چبوترے پر قائم ہے جو مذکورہ مسجد کے صحن میں مدفون تین شہدا کے ذکر و اذکار اور عبادت کا (مچان) چبوترہ تھا - یہ شہدا چند سو سال قبل شہید ہوئے تھے اور وقتاً فوقتاً قبرستان کے مکینوں کو اپنی حیات جاوید کی نوید دیتے رہتے ہیں -

پروفیسر محمد منور صاحب نہایت بذلہ سنج اور خوش گفتار بزرگ تھے - کڑوی سے کڑوی بات بھی ہنس کر بیان کرتے تھے اور یہی مرزا صاحب کا عمر بھر کا سلیقہ و قرینہ تھا - مرزا صاحب سچ بات خواہ کتنی ہی تلخ ہو، شیریں پیرائے میں بیان کرتے تھے کہ سننے والے سر جھولتے تھے اور مرزا صاحب کی یہی بذلہ سنجی آخری وقت تک قائم رہی --- اہل خانہ قبلہ منور صاحب کو ہسپتال لے جانے کے لیے لباس تبدیل کرانے میں مدد کر رہے تھے - جس وقت مرزا صاحب کو سوئیٹر پہنا رہے تو ان کے دیرینہ خادم بابا اورنگزیب اور صاحبزادی نے کہا کہ '' ابا جان ! آپ کا جسم خاصا ناتواں اور کمزور ہو گیا ہے مگر خدا کا کرم ہے کہ آپ کا چہرہ تاحال پر رونق اور روشن ہے --- قبلہ منور صاحب نے فوراً مسکرا کر جواب دیا کہ یہ چہرہ روئے منور ہے -- یہ ہمیشہ چمکتا رہے گا --- اس میں کوئی شک نہیں کہ

پروفیسر منور صاحب کی زندگی بھی ایک روشن ،منور اور تاباں زندگی ہے جو اپنی لازوال تحریروں اور اپنے عزیز و اقارب کے دلوں میں لافانی محبت و ارادت کے باعث ہمیشہ درخشاں رہے گی -

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را